معصومہ

عصمت
چغتائی

پہلا باب

جی ہاں یہ چرچ گیٹ ہے - جی یہاں چرچ تو آس پاس کوئی نہیں ، ہاں گیٹ بہت سے ہیں - اگر آپ لوکل ٹرین سے اُتر کر ناک کی سیدھ میں چلتے چلے جائیں تو وزن کرنے کی مشین کے پاس سے گزر کر برف کے پیاؤ کو پار کریں گے - دائیں ہاتھ کو باہر نکلنے کی چکریاں نظر آئیں گی - یہ پھندے اُن بے ٹکٹ سفر کرنے والوں کے لیے ہیں جو ایک دم بچوں اور عورتوں کے ریلے کے ساتھ سٹک لیتے ہیں - ان چکریوں میں سے ذرا قاعدے سے نکلیے گا ، ورنہ گھٹنے کی چپنی پر وہ مزے دار چوٹ لگے گی کہ کئی دن تک لنگڑانا پڑے گا - یہاں آپ کو دونوں کونوں پر دو اکتائے ہوئے ٹکٹ چیکر کھڑے باتیں کرتے نظر آئیں گے - آپ چاہیں تو کوئی پرانا ٹکٹ انہیں تھما دیں یا وزن کا ٹکٹ ہی پکڑا کر جھپ سے نکل آئیں ، یہ بالکل بے توجہ آپ کے آر پار ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہیں گے - ذرا دیکھ کے بھائی ! عین سیڑھیوں کے نیچے پان کی پیک گھلی ہوئی کیچڑ بہہ رہی ہے - آپ چاہے کتنی کھوج لگائیں ، یہ پتہ نہیں چلا سکتے کہ اس کیچڑ کا نکاس کہاں سے ہوتا ہے ؟

آسمان سے ٹپکتی ہے یا زمین سے سوتا پھوٹتا ہے ؟ کوئی اور چھور نہیں نظر آتا ۔ دائیں ھاتھ پر دیوار کی طرف منه کیے آپ کو نچی ھوئی مرغی کی صورت کی ایک شری متی جی نظر آئیں گی ۔ جب تک سورج یا سڑک کے کھنبے کی روشنی رهتی ہے یه بڑی احتیاط سے ٹٹول کر اپنے چھدرے کھچڑی بالوں میں سے جوئیں اور لیکھیں سونت کر پہلے تو بڑے غور سے آنہیں پرکھتی ھیں ؛ اس وقت ان کے جھریوں دار چہرے پر فتح مندی کے آثار چھا جاتے ھیں ، جیسے غوطه خور اپنی جان کی بازی لگا کر پانی کی تہه سے موتی نکال کر لایا ہو ؛ پھر وہ اس ناھنجار جوں کو بائیں ھاتھ کے انگوٹھے کے ناخنوں پر لٹا کر دائیں ھاتھ کے ناخنوں سے قتل کر دیتی ھیں ۔ اگر آپ انہیں جوں مارتے دیکھیں تو یہی سمجھیں گے که وہ بڑی کاری گری سے کسی نازک سی انگوٹھی میں کوئی انمول نگینه جڑ رھی ھیں ۔ جوں کو ٹھکانے لگا کر ان کی آنکھوں کی بھڑکتی ھوئی انتقام کی آگ دم بھر کو ٹھنڈی پڑ جاتی ہے ، جیسے انہوں نے ایک موٹی سی جوں نہیں کسی سود خور توند والے کا صفایا کر دیا ھو ۔ ناخون پر جب بہت سی لاشیں چپک جاتی ھیں تو وہ سامنے دیوار پر ناخون رگڑ کر چھڑا دیتی ھیں ، پھر نئے سرے سے نئے شکار کے پیچھے انگلیوں کے گھوڑے چھوڑ دیتی ھیں ۔ ذرا دیوی جی کے

چیتھڑ اور سامان سے بچ کر نکلیے گا، ورنہ آپ کو ایسے گھوریں گی جیسے کسی پردہ نشین دوشیزہ کی خواب گاہ میں آپ بے محابہ درآّ کر گھس آئے ہوں!

ذرا دونوں طرف آتی جاتی گاڑیوں سے بچ کر فٹ پاتھ پر آ جائیے نا! نائی کی کہنی میں گھٹنا نہ لگے برادر، ورنہ سر منڈانے والے کے سر پر واقعی اولے برس جائیں گے۔ یہ سڑے ہوئے کیلے جو بیچ رہی ہے نا! اس کے پاس پان بیڑی کا خونچہ ہے، ذرا احتیاط سے پھلانگیے — شاباش!

ست کار ہوٹل سے نکلتے ہوئے باسی ،اڈلی ڈوسے کے بھبکے سے ناک سمیٹئے ایک اور پر اسرار کیچڑ لانگ کر بھیل پوری والے کی بالٹی پھلانگیے — بالکل ٹھیک! اب ذرا دیوار پر بیٹھے ہوئے نیلم فلم سٹار کے لے پالک بچوں کی لاتوں کے وار خالی دیتے ہوئے، بجری کے ڈھیر سے کاوا کاٹ کر سیدھے آر۔اے۔ملک کی ڈبہ نما دکان سے ٹکرا جائیے۔ ٹھیک! خیر کوئی بات نہیں — یہ اے۔روڈ ہے۔ یہاں دو چار گوموڑے تو آئے دن پڑتے ہی رہتے ہیں۔ بس جی کڑا کر کے چلے آئیے۔ کیلوں کے چھلکوں پر رپٹتے — کتّوں کی ڈوریوں میں اُلجھتے — باس!

یہ جیے ہند کالج کے بالکل سامنے جس بلڈنگ کے احاطے پر سب سے زیادہ بچے لدے ہوئے نظر آئیں وہی انڈس کورٹ

ہے ۔ بیچ کے پھاٹک کے ایک بازو دیوار پر آپ کو ادھ کچری لڑکیاں بیٹھی نظر آئیں گی اور دوسری طرف اونگے بونگے بڑھتے ہوئے لڑکے ۔ ان لڑکیوں میں آپ کو مارلن منرو ، برژت باردو اور سینڈرا ڈی کی جھلکیاں نظر آئیں گی اور لڑکے ایلوس پرسلے، جی ڈین اور رکی نیلسن کی پرچھائیاں معلوم ہوں گے ۔ یہ دیوار انڈس کورٹ میں رہنے والوں کے لیے نہایت اہمیت رکھتی ہے : یہیں بیٹھ کر عشق کیے جاتے ہیں ، منگنیاں طے ہوتی ہیں ، شادیاں ہوتی ہیں اور اس دیوار پر جڑنے کے لیے نگینے پیدا ہوتے ہیں ۔ اس آواگون کے سلسلے سے بے نیاز یہ دیوار پان کی پیکوں اور ووٹ مانگنے والوں کے پروپیگنڈے کا بے زبان شکار بنی رہتی ہے ۔

انڈس کورٹ کے گراؤنڈ فلور پر گروگرنتھ جی کا استھان ہے ۔ بھولی سی شکل کا گدگدا سا بچاری میلی سی بنیان اور تہمد پہنے سیڑھیوں پر کھڑا جمائیاں لیا کرتا ہے ۔ اس کی گدی پر نیبو کے برابر لٹکا ہوا بالوں کا جوڑا ہمیشہ تیل میں بھیگا رہتا ہے ۔ ویسے دن بھر نیچے راک اینڈ رول کے فلمی ریکارڈ بجا کرتے ہیں ، لیکن شام کو خوب لوبان جلا کر بھجن گائے جاتے ہیں ۔ مگر ان بھجنوں میں دل نہیں لگتا ، اس لیے وہ عموماً فلمی دھنوں پر بھجن کی ٹیون

بنا لیتا ہے اور رات گئے تک ڈھول پیٹا کرتا ہے ۔

اور جب گرو گرنتھ کے استھان سے '' لال لال گال ''
اور '' ریشمی شلوار '' سنائی دیتا ہے تو انسان خواہ مخواہ
خدا کی ذاتِ بابرکات کا قائل ہوجاتا ہے ۔ اُس کی شان نرالی
ہے ۔ وہ چاہے تو پتھر پر پھول کھلا دے اور مندروں
مسجدوں میں راک اینڈ رول بجوا دے!

یہاں پہلے مالے پر میرا گھر ہے ۔

اگر بالکنی میں قبلہ کی طرف منہ کر کے کھڑے
ہوں اور نیک نیت باندھ کر چالیس ڈگری کا زاویہ بنا
کر دیکھیں تو آپ کو نیلو فر کا فلیٹ صاف نظر آئے گا ۔
جی وہی سا ، جو سب سے زیادہ بھڑکدار فلیٹ ہے ، جس
کے کمرے گہرے فیروزی اور گلابی رنگے ہوئے ہیں ،
جہاں نیون لائٹ کی روشنی میں ریشمی پردے جھلملا رہے
ہیں ۔ جی وہی بلڈنگ ، جس کے سامنے تگڑی تگڑی
موٹریں ڈٹی ہوئی ہیں ۔ یہ موٹریں یہاں سر شام ہی آ جاتی
ہیں اور رت جگا منا کر صبح چلی جاتی ہیں ۔ ان کے
ڈرائیور قریب کی عمارتوں کی آیا لوگ کے ساتھ اور مالک سامنے
کے جگمگاتے ہوئے فلیٹ میں داد عیش دیا کرتے ہیں ۔
پاس ہی اسمگل کی ہوئی شراب کا اڈا ہے ۔

وہ جو رس گلے جیسے بھرے بھرے جسم والی لچکدار

حسینہ ہے ، وہی اس فلیٹ کی آن داتا ہے ۔ اس فلیٹ تک لانے کے لیے ہی تو میں نے آپ کو اتنی زحمتیں دیں اور اتنی تفصیلیں بتائیں کہ کہیں آپ اُس طرف نہ بھٹک جائیں جدھر راک اینڈ رول کی دُھن میں بھجن گائے جا رہے ہیں ۔ نیلوفر جب پیدا ہوئی تھی تو قرآن شریف میں دیکھ کر اُس کا نام معصومہ بانو رکھا گیا تھا ۔ تین بیٹوں پر بیٹی جو پیدا ہوئی تو جی بھر کے لاڈ پیار ہوئے ۔ خالہ جانی اور چھوٹے ماموں میں جھگڑا ہو گیا تھا ۔ دونوں ہی اپنے اپنے بیٹے کے لیے آسے مانگنے پر اڑے ہوئے تھے ۔ نیلوفر کی پیٹھ پر زبیدہ اور حلیمہ پیدا ہوئیں اور جب پیٹ کی کھرچن سب سے چھوٹا بچہ سال بھر کا تھا تو قیامت ٹوٹ پڑی ۔

مملکت خدا داد میں قاسم رضوی کی کمانڈ میں دلی کے قلعے پر جھنڈے گاڑنے کے منصوبے باندھے جا رہے تھے ۔ معصومہ عرف نیلوفر کے والد ماجد اس فوج کے رکنِ خاص تھے اور خطرے کی گھنٹی بجتے ہی اپنے بڑے بیٹوں کے ساتھ روپیہ پیسہ ، قیمتی زیورات اور مکانوں کے کاغذات لے کر اڑ گئے ۔

صرف گود کا بچہ سلیم اور تینوں لڑکیاں بیگم کے ساتھ رہ گئے ۔ ارادہ تھا کہ وہاں پیر جم جائیں گے تو سب کو

بلا لیں گے ۔

مگر نہ جانے کیا ہو گیا انہیں وہاں جا کر کہ لوٹ کر خبر ہی نہ لی ۔ بڑے لڑکوں نے شادیاں کر لیں، بڑے بڑے عہدوں پر جم گئے ، مکانات اور زمینیں بھی الاٹ کرا لیں ، تب کہیں جا کر ماں اور بہنیں یاد آئیں ۔

اور تو اور بڑے میاں نے بھی ایک انیس برس کی لونڈیا سے بیاہ رچا لیا ۔ بیگم صاحبہ نہ بیٹوں کی شادیوں کی خبر پر ہنسیں نہ سوت آنے پر روئیں ۔ جو کچھ میاں چھوڑ گئے تھے وہ کچھ دن کام آیا ۔ پھر بچے کھچے زیور سے کام چلایا ۔ کچھ دن ہاتھوں کی چوڑیاں چبائیں ۔ پھر جگنو ، چپا کلی اور نوگھریاں نکلیں ۔ پھر بازو بند اور بچوں کے زیور بھی پیٹ کی کھٹی میں اتر گئے ۔ کون تفصیل میں جائے ؟ کچھ ہؤا ہی ہوگا کہ وہ بستر بوریا سمیٹ کر بمبئی آ گئیں ۔

لوگوں کا خیال ہے کہ بمبئی اس لیے آئیں کہ یہاں ہر مال کی اچھی قیمت ملتی ہے ۔ بمبئی شہر دل والے متوالوں کی بستی ہے ۔ یہاں ہر شئے کے قدردان جی کھول کر دام دیتے ہیں ۔ چاہے وہ پرانی موٹریں یا اعلا حضرت کی داشتاؤں کے زیورات ہوں ، یا کماؤ بیٹے اور لچکدار بیٹیاں ہوں ، نسبتاً دوسرے شہروں سے بمبئی میں مہنگے بکتے ہیں ۔

پہلے تو آ کر وہ ایک جان پہچان کے ہاں رہیں ۔ آن کی بیوی نے جب دانت نکوسے تو آنھوں نے از راہِ مہربانی دادر میں ایک کمرہ دلوا دیا ۔ بےچارے خود ہی کرایہ بھی دے دیا کرتے اور کچھ آدھار بھی ۔ کام چلتا رہا ۔ ان عنایتوں کے بدلے میں کبھی کچھ نہ مانگا ۔ احسان بس سرِ شام سے آ کر بیٹھ جاتے ۔ بچوں کے ساتھ ہنس بول کر بارہ ایک بجے چلے جاتے ۔ بیگم نے اصلی گھی کھایا تھا ، پھر بھی اب بالوں میں کہیں کہیں چاندی جھلکنے لگی تھی ۔ پہلے تو انہوں نے نکاح پر ضد کی ، مگر جب آٹھ دن کے لیے مہربان دوست کسی ضروری کام کی وجہ سے نہ آ سکے تو نویں دن آن کی صورت دیکھ کر بیگم کی نرگسی آنکھوں میں موتی جھلکنے لگے ۔

دو سال اسی طرح گزر گئے ۔ سلیم میاں کے اسکول کا خرچ اور لڑکیوں کی ضروریاتِ زندگی تنگی ترسی سے پوری ہوتی رہیں ۔ تانبے کے کچھ برتن حیدر آباد پڑے تھے ، بیگم کو آنہیں بیچنے کی غرض سے جانا پڑا ۔ ہفتہ بھر لگ گیا ۔

واپس لوٹیں تو بچے جوھوگئے ہوئے تھے ۔ واپس لوٹے تو نہ جانے کیوں بیگم کو ایسا لگا معصومہ بہت جوان ہو گئی ہے ۔ آس کی شادی کی فکر برچھی بن کر کلیجے میں آتر گئی ۔ نہا کر معصومہ ایک پھول دار ھاؤس کوٹ پہنے تولیہ

سے بال پونچھتی نکلی تو انہیں بڑا تعجب ہؤا ۔ یہ نیا قیمتی تولیا ، یہ پھول دار ھاؤس کوٹ — یہ تو شاید پہلے نہیں تھا !

اور پھر طوفان پھٹ پڑا ۔ اُن کا بس چلتا تو معصومہ کا قیمہ کر کے کتوں کو کھلا دیتیں ، مگر اُس نے قسمیں کھا کر یقین دلانا چاہا کہ احسان صاحب نے سیریں کرائیں ، پاؤڈر ، لپ سٹک دلوائی ، ڈریسنگ گاؤن لے کر دیا ، اس کے علاوہ کچھ بات نہیں تھی ۔ بیگم کے آنسو شاید کبھی کے جل چکے تھے ۔ وہ رات بھر کروٹیں بدلتی رہیں ، آہیں بھرتی رہیں ۔

دوسرے دن جب احسان صاحب آئے تو وہ ان کی جان کو جھاڑ کا کانٹا بن کر چمٹ گئیں ۔

” بےکار پریشان ہو رہی ہو ۔ میری بیٹیاں ہیں ۔ اگر کچھ دلا بھی دیا تو کیا غضب ہوگیا ؟ کیا آمنہ ، فریدہ کو نہیں دلا دیتا ؟ “

” مگر معصومہ ھی آپ کی لاڈلی بیٹی ہے ؟ زبیدہ اور حلیمہ سوتیلی ھیں ؟ سلیم تو خیرات کا ہے ! اسی کتیا کو ساری چیزیں دلا دیں ۔“

” بھئی تم تو جان کو آ جاتی ہو — اب تم سے بات کی جائے تو کیسے ؟ دراصل وہ احمد بھائی میرے دوست ھیں نا

— انہوں نے — آن کا جنرل اسٹور ہے — مانے ہی نہیں — سلیم میاں کو ھاکی اسٹک اور مکینو کا سیٹ پسند آیا ۔''

'' کون احمد بھائی ؟ ''

'' جنرل مرچنٹ — باندرہ میں رہتے ہیں — لکھ پتی ہیں — ایک اسٹور مارکیٹ میں ہے ایک کلابہ میں ۔ باندرہ میں فرنیچر کی دکان ہے ۔ بڑے آدمی ہیں ۔ ''

بیگم سناٹے میں رہ گئیں ۔

'' اے ہے — مجھ سے کہا بھی نہیں — ہمت نہیں پڑتی تھی آپ سے کہنے کی — لڑکیوں کے والی آپ ہی ہیں — ان کا انتظام ہو جائے تو — مگر میرے پاس لینے دینے کو کچھ نہیں ۔ ''

'' ہاں ہاں — اس کی فکر نہ کرو ۔ '' وہ کچھ خجل سے ہو گئے ۔ '' فلیٹ ابھی خریدا ہے آنہوں نے دادر میں — اونر شپ پر — ''

بیگم کے دل سے دعاؤں کے جھکھٹ نکل پڑے ۔ بچے سو گئے ۔ وہ احسان صاحب کے پاس بیٹھی گلوریاں بنا بنا کر اپنے ھاتھ سے منہ میں دبتی رہیں ۔

'' انہیں لائیے نا ایک دن ۔''

'' تمھارے پیچھے تو کئی دفعہ آئے ۔ بھئی میں نے سوچا یہ موقعہ ھاتھ سے نہ جائے تو اچھا ہے ۔ ''

” خیر آپ گھر کے مالک ہیں ۔ مگر کل انہیں کھانے پر بلائیے ۔ “

احمد بھائی سورت والا دوسرے دن آئے ۔ کوئی پینتالیس برس کے۔ملگجا پاجامہ ،کتھئی اچکن ،رومی ٹوپی پہنے ۔ انہیں دیکھ کر بیگم دھک سے رہ گئیں۔ سوچا :

” بجائے مہندی کے اللہ کا بندہ خضاب لگائے تو اتنا بھونڈا نہ لگے ۔“ احمد بھائی ایک نیکلس لائے تھے ، جو انہوں نے معصومہ کو دے دیا ۔

” آوں — ہم نہیں لیتے ۔“ معصومہ ٹھنکنے لگی ۔

” کیوں جی ؟ “ احمد بھائی پان بھرے دانت نکوس کر بولے ۔

” کیوں لیں ؟ ہمیں نہیں اچھا لگتا ۔ “

” نہیں اچھا لگتا تو دوسرا لائے گا بابا ۔ “

” ہم دوسرا بھی نہیں لیں گے ۔ “ معصومہ کھلکھلا کر ہنسی اور کمرے سے باہر بھاگ گئی ۔ احمد بھائی اس ادا پر لوٹ پوٹ ہو گئے ۔

” آج چھوکری کو جوھو لے جاوے؟ جرا تم بولو نا ۔“ انہوں نے ٹھنک کر احسان صاحب کے کان میں کہا ۔

” اماں ذرا نگاہیں داب کے — ہاں ! ورنہ سارا معاملہ چوپٹ ہو جائے گا ۔“

'' سالا پیسہ جاستی مانگتا تو کوئی وانده نہیں — ہم دے گا بابا ۔'' احمد بھائی بلبلائے ۔

'' اے یار پیسہ کی بات نہیں ۔ اونچے گھرانے کی لونڈیا ہے ۔ سلونا برس لگا ہے ۔ کسی نے آج تک اس کا آنچل بھی نہیں دیکھا ۔ اتنی تاولی نہیں چلے گی ۔ جلدی کام شیطان کا ۔'' احسان نے سمجھایا ۔

مگر جب بیگم کو احسان میاں کی دلالی کا پتہ چلا تو اُن کی سوکھی آنکھوں میں شعلے بھڑک اُٹھے :

'' صورت تو دیکھو جھڑوس کی ۔ میری نازک بچی کو بس یہ کیڑوں بھرا کباب ھی رہ گیا ہے ؟ کل کی لونڈیا سے شادی کر کے داڑھی کو کالک لگوائے گا ۔''

مگر بڑی میٹھی آواز میں احسان میاں نے سمجھایا کہ احمد بھائی ایسے کمینے نہیں جو نکاح کرنے کی گستاخی کریں ۔ نکاح تو وہ کر بھی نہیں سکتے ۔ اُن کے سسر بارسوخ آدمی ھیں ، چندیا پر ایک بال نہیں چھوڑیں گے ۔''

پھر تو بیگم شتابہ بن گئیں ۔ ھر طرف چنگاریاں برسنے لگیں ۔ اُنھوں نے اتنا تکلف کیا کہ احسان میاں کو نکالتے وقت جوتے نہیں لگوائے ۔

احمد بھائی کی آنکھوں میں آنسو تھے!

'' تم ھم کو اُلو کا پٹھا سمجھتا ہے سالہ — پہلے بولا

چھوکری ملتا ، پھر بولا نئیں ملتا — یہ کیا لفڑا ہے ؟ ''

'' دھیرج کا کام ہے سیٹھ ۔ پکا پھل کتنے دن ڈال پر
اٹکا رہے گا ؟ تم میرے پر بھروسہ رکھو ۔ اونچا مال نیک ہاتھ
پر نہیں ملتا — صبر تو کرو کچھ دن ۔ ''

'' اچھا بابا — صبر کرے گا — پن کتنا روج ؟ '' احمد
بھائی عاشق صادق کی طرح آہ بھر کر بولے ۔

'' ریٹا کے بال بچہ ہونے والا ہے سیٹھ — وہ سالی دنگا
مچائے گی ۔ پہلے اس کا معاملہ ذرا ٹھنڈا پڑ جانے دو ۔''

'' تم کیا بات کرتا ؟ سالی ریٹا کا ہم اکھّا کھرچ
دیتا ہے اور پھر بھی دے گا ۔ تمہارے کو اس کا کیا وری
کرنے لگا — کوچھ لفرا نہیں کرے گا — ہم پیر بھائی سے
بات بھی کیا — وہ سالہ فلیٹ کا ایڈوانس بھی لے لیا
ہم نے ۔ ''

'' شانتا کروز والا فلیٹ آپ بیچ رہے ہیں ؟ ''

'' نہیں بیچیں تو کیا کرے ؟ اپنا فادر ان لا بوت
بوما بوم کرتا ۔ سالا چھوکری ایک دم بدمعاش ! ''

'' کون سی چھوکری ؟ '' احمد بھائی کی بات سمجھنا
ہنسی ٹھٹھا نہیں ۔

اصل بات یہ تھی کہ ریٹا سے اُن کا دل بھر چکا تھا ۔
'' بڑی کھٹ کھٹ کرتی ہے ! '' بہت دن سے سیٹھ کو

شکایت تھی کہ آن کی سگی بیوی اتنی سوتیا ڈاہ میں نہیں جلتی جتنی ریٹا سلگتی تھی ۔ آس نے ان کے پیچھے جاسوس لگا رکھے تھے ۔ پیر بھائی عرصہ سے اس کے مداحوں میں سے تھے ۔ ان سے مراسم بڑھے اور احمد بھائی نے بڑی خوشی سے مکان کے جملہ سامان کے ساتھ ریٹا کو انہیں تھما دیا ۔ اب اس کے بچہ ہونے والا تھا ، جس کا الزام دونوں اپنے آوپر نہیں لینا چاہتے تھے ۔ ریٹا کا ایک دوست آیا کرتا تھا جسے وہ اپنا بھائی بتاتی تھی ، مگر بعد میں معلوم ہؤا وہ کسی زمانہ میں اس کا فیانسے تھا ۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا آسی نے ریٹا کا ناس مارا تھا ۔ چھ سال تک غائب رہا ۔ اب واپس لوٹا تو پھر چالو ہو گیا ۔ ہونے والا بچہ اصل میں آسی کا تھا ۔ احمد بھائی ادھر کئی ماہ سے ملے ھی نہیں تھے آس سے ۔ ایک دم آس سے جی آوب گیا ۔ صورت دیکھ کر بخار سا چڑھنے لگا تھا ۔ پیر بھائی بالکل دیمک زدہ معلوم ہوتے تھے مگر اپنی جائیداد کے خود مالک تھے ۔ بیوی مر چکی تھی ۔ وہ تو شادی کرنے کو بھی تیار تھے مگر ریٹا ھی ٹال گئی ۔ شادی ہو گی تو بے چارے پیر بھائی کو دوسری کوئی رکھنا پڑے گی ۔

'' پھر بھی سیٹھ ایسی لڑکی آسانی سے نہیں ملا کرتی ہے ۔ میرے آوپر بھروسہ رکھو ۔ میں نے کڑیاں کسنی شروع کر

دی ہیں ، بس کوئی دم میں تمہارا کام بن جائے گا ۔''
مگر احمد بھائی کبیدہ خاطر ہی رہے ۔

'' سالہ روپ چند کو کتنا چھوکری سے انٹروڈیوس کراتا ہے لال جی آس کا اسٹنٹ فلم والا ۔ یہ سالہ سوشل فلم والا ایک دم کنڈم ہوتا ہے ۔ ہم کو روپ چند بولا : 'ہمارے ساتھ آجاؤ ۔' او لوگ کھنڈالا جاتا لوکیشن دیکھنے کو — اکھا چھوکری بیکری لے کر ۔ ہم کو دو کیس بیئر اور وھسکی کو بولا — ہم بولا بھائی کا جو ملے گا — وھسکی اگلے ہفتے دے گا — کیا دما دم چھوکری ہے سالہ — ''
احمد بھائی نے لڑکیاں اور بوتلیں اُلجھا دیں ۔

'' روپ چند ایک چور ہے ۔ لال جی سر پیٹ رہا تھا کہ مجھے کہیں کا نہیں رکھا ۔ ہنڈی پہ ہنڈی لکھاتا جا رہا ہے ، پیسہ نکلتا نہیں ۔ سات دن سے سیٹ کھڑا ہے اور سائیڈ ہیروئن غائب ! بولو تو کہتا ہے دوسری لے لو ۔ اب بھلا بتائیے بیچ پکچر سے دوسری لے لو ۔''

'' دوسری تو لینا ہی پڑینگا — ہیں ہیں ہیں — ''
احمد بھائی ہنسے ۔ سائیڈ ہیروئن روپ چند سے بہت جلدی بیاہ کرنے والی تھی ۔ مگر احسان بھائی کو معلوم تھا روپ چند دوسری شادی نہیں کر سکتا ۔

احمد بھائی کو سمجھا بجھا کر احسان صاحب نے کڑیاں

کسنے کا نیا پروگرام بنایا اور اس پر شدت سے عمل درآمد کرنے لگے ۔

بیگم کمر کمر دلدل میں پھنسی ھاتھ پیر مارنے کی کوشش کر رھی تھیں ، مگر ھلکی سی جنبش بھی انہیں اور نیچے کھینچ رھی تھی ۔ اژدھے کا دھانہ چوڑا ھوتا جا رھا تھا ۔ چھ سات مہینے کا کرایہ نہیں دیا تھا ۔ باورچی روز غراتا ۔ کمبخت نمک کی ڈلی میں سے بھی اپنا حصہ نکال لیتا تھا ۔ گوشت لاتا جیسے چھیچھڑے ، کوڑے پر سے ترکاری اٹھا لاتا اور ان سے پورے دام لیتا ۔ مارکیٹ میں سڑی گلی ترکاری کے ڈھیر کا لوگ ٹھیکہ لے لیتے ھیں ۔ یہ ترکاری ٹوکروں میں بھر کر ھوٹلوں وغیرہ میں پہنچا دی جاتی ھے یا غریب لوگ اونے پونے خرید لیتے ھیں ۔ اس میں بعض وقت اچھے خاصے ترکاری کے ٹکڑے بھی مل جاتے ھیں ۔ بیگم جانتی تھیں کہ باورچی اپنی تنخواہ کے پیسے تو نکال ھی لیتا ھے ، پھر بھی کچھ کہنے کی ھمت نہیں تھی ۔ وہ احسان صاحب ھی سے کچھ دبتا تھا ۔ اب احسان صاحب بھی کچھ چپ چپ سے نظر آرھے تھے اس لیے وہ اور شیر ھوتا جا رھا تھا ۔ لڑکیوں نے بھی دو چار بار شکایت کی کہ وہ وقت بے وقت انہیں تاکا کرتا ھے ۔ دروازوں کے شیشوں پر سفید وارنش کی ھوئی تھی ، وہ دو ایک جگہ سے کسی نے

کھرچ کر باقاعدہ ایک آنکھ کے جھانکنے کا انتظام کر لیا تھا ، اور عموماً جب لڑکیاں کپڑے بدلتی ہوتیں تو ان کھرچے ہوئے حصوں میں کالونچ بھر جایا کرتی تھی ۔

بچوں کی فیسیں نہیں گئی تھیں اور نام کٹنے کی دھمکیاں آ رہی تھیں ۔ ڈاکٹر کا بل تو سال بھر کا چڑھ گیا تھا ۔ احسان صاحب نے ان ہی کے لیے کھاتا کھلوا دیا تھا ۔ آہستہ آہستہ بل بڑھتا رہا ، خبر ہی نہ ہوئی ۔ دودھ والے نے تو کھڑے کھڑے پیسے رکھوا لیے ۔ احسان صاحب بہت چیں بہ جبیں ہوئے :

” میرے پاس قارون کا خزانہ تو نہیں — میں بھی بال بچوں والا آدمی ہوں ۔ “ انہوں نے بڑے مجبور لہجہ میں کہا ۔

مگر بیگم کی کان نہ جھکی۔ انہی دنوں کسی نے رائے دی تھی کہ لڑکیوں کو فلم میں ڈالو ، بڑی کامیاب رہیں گی ۔ اس زمانہ میں شیواجی پارک اور دادر میں کئی پروڈیوسر رہتے تھے ۔ باری باری وہ سب ہی سے ملیں ۔ رنجیت اسٹوڈیو کی خاک چھانی ۔ایک دوست کے ساتھ مجھ سے بھی ملنے آئیں ۔ مگر ہماری فلم کی کاسٹنگ ہو چکی تھی ۔ دوسرے اس وقت جس انداز سے انہوں نے اپنی عالی نسبی کی ڈینگیں ماریں اس سے جی جل اٹھا ۔ ایسا معلوم ہوتا

تھا وہ معصومہ بانو کو فلمی دنیا میں لا کر فلم لائن پر ہی نہیں میری سات پشتوں پر احسان کر رہی ہیں ۔ دوسرے وہ سمجھتی تھیں کہ بس فوراً ہی کانٹرکٹ ہو جائے گا اور پیشگی مل جائے گی ۔ مگر ہفتہ بھر تک تو پروڈیوسر سے ملنے کی نوبت نہ آئی ۔ روز جا کر اسٹوڈیو میں بیٹھی سوکھا کرتیں ۔ ملاقات تو درکنار ، کوئی نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتا ۔ پھر جھاڑ جھلے کپڑے پہنے ، شرمائی ، لجائی معصومہ کو کون غور سے دیکھتا !

بیگم کے تیہے نے اور کام بگاڑ دیا ۔ وہ ہر شخص پر اپنا بیگماتی رعب جمانا شروع کر دیتیں ۔ اناڑی نائیکہ بھلا کیا معصومہ جیسی الھڑ لڑکی کو بنا پاتی ۔ انجام کار قرض بڑھتا گیا ۔ احسان بالکل روٹھ گئے ۔ مکان والے نے دانت نکوس نکوس کر تقاضے کرنے شروع کر دیے ۔ بچوں کے نام اسکول سے کٹ گئے ۔ پیدل اسٹوڈیو کی خاک لیتے لیتے جوتے گھس گئے ۔ کسی نے غور سے معصومہ کو دیکھا تک نہیں ۔ مگر جس چیز نے بیگم کی کمر توڑ دی وہ شوہر کے بیاہ کی خبر تھی ۔ بڑے میاں نے ایک انیس برس کی کومل سی لونڈیا سے نکاح پڑھوا لیا اور بیگم کو وقتِ ضرورت طلاق دینے کا پکا وعدہ کر لیا ۔

اس دن وہ پہلے تو کمرہ بند کر کے روتی رہیں ، پھر

اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا ، چوٹی کی اور خانساماں کو احسان صاحب کے پاس بھیجا ۔ خانساماں کچھ اکڑفوں دکھانے لگا تو انہوں نے وہ زور کی ڈانٹ بتائی کہ بھاگا بے چارہ۔ آسے کیا معلوم چند گھنٹوں میں بیگم کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہیں !

احسان آئے تو بیگم ماتھے پر کہنی کا چھجہ بنائے لیٹی تھیں ۔

” اللہ کیا دماغ ہو گئے ہیں حضت — بلاوے بھیجنے پڑتے ہیں ۔ میں تو اب انویٹیشن کارڈ چھپوا رکھوں گی ۔ وقت بے وقت بھیجنا پڑ جائے تو ۔ “

احسان صاحب نے ٹھنڈی سانس بھری اور وہیں قدموں پر ڈھیر ہو گئے ۔

اس دن بیگم کی خاندانی جھجک نے دم توڑ دیا ۔ انہوں نے حامی بھر لی ۔ فلیٹ بچی کے نام ہو گا ۔ ایک ہزار کا بندھا خرچ ہے ۔ لڑکی بغیر آن کی مرضی کے رات کو باہر نہیں رہے گی ۔ شاید اس طرح انہوں نے اپنے شوہر سے بدلہ لے لیا ۔ آدھر وہ کسی کی انیس برس کی کونپل کو کھول کر رہے تھے ادھر آن کی اسی عمر کی بیٹی کے دام لگ رہے تھے ۔ بڑے میاں کو خبر ملے گی کہ صاحب زادی نے دھندا شروع کر لیا تو مزہ آ جائے گا ۔

'' آج ؟ نہیں نہیں — مہلت چاہیے ۔ '' وہ احسان کی تجویز پر بھڑکیں ۔

'' تمہاری مہلت نے تو میرا تختہ کر دیا ۔'' وہ جھلا کر بولے ۔ '' حرام زادہ سائینٹنگ منی تک دینے کو تیار نہیں ۔ کہتا ہے میرا کچھ انفلوینس ہی نہیں ۔ ایسے آدمی کا کیا بھروسہ ؟ ''

جب ڈاکٹر زخم چھیڑنے کے لیے نشتر بڑھاتا ہے تو مریض گڑگڑا کر اس کا ہاتھ تھام لیتا ہے : '' ذرا ٹھیر جائیے — بس ذرا — ''

مگر آپریشن تو ہونا ہی ہے ۔ ڈاکٹر کتنے دن ذرا ٹھیر سکتا ہے ؟

'' لڑکی کی طبیعت ذرا کسلمند ہے ۔ '' انہوں نے احمد بھائی کو بہلایا ۔

'' ارے ہٹاؤ سالی کو — ہم آج پونا جاتا ہے ۔ ''

'' پھر کب لوٹیں گے ؟ ''

'' ریس کا سیزن آدھر ہی رہے گا ۔ ہم سوچتا ہے آدھر نویگ اسٹوڈیو ملتا ہے ، سو لے لیوے ۔ ''

'' ارے ہٹائیے بھی — نویگ میں کیا دھرا ہے ؟ کوڑا پھنکوانے ہی میں آدھا پیسہ اڑ جائے گا ۔ اور وہ سالی مسز مچل آپ کو اُلو بنا رہی ہے ۔ گھنا ہؤا مال ہے قطامہ کے

پاس۔ گھسی پٹی گوروں کی جھوٹن اینگلو انڈین چھوکریاں۔ اور پھر سیٹھ ساجھے کا مال تمہیں ہضم نہ ہوگا۔''

احمد بھائی آبائی ڈرپوک تھے، کچھ سہم گئے۔

'' ایسی بھی کیا تاولی ہے سیٹھ ؟ سنیچر کو چھوکری چالو ہو جائے گی۔ '' آنکھ ماری۔

'' مخول کرتا ہے۔'' احمد بھائی مسکرائے۔

'' تمہارے سر کی قسم — اچھا چلو مجھے سامان تو دلوا دو — سیٹ کل تک کھڑا ہو جائے گا۔''

یہ سیٹھ سمجھتے ہیں عقل کا ٹھیکہ بس انہیں کے پاس ہے۔ ہر شئے پر نگاہ رکھیں گے، ہر سامان خود جا کر اپنی آنکھوں کے سامنے خریدیں گے تاکہ پروڈیوسر ٹھگ نہ لے۔ مگر پروڈیوسر بھی ایک گھاگ ہوتے ہیں ؛ ویسے تو کہہ دیتے ہیں کہ جب تک فلم کی بزنس نہیں ہو جاتی وہ خود کوڑی نہیں لیں گے، بس پروڈکشن پر جو خرچہ ہوگا وہی فنانسر کو دینا پڑے گا۔

سیٹ کے لیے بیس ہزار کی لکڑی آنی تھی۔ پہلے تو احمد بھائی نے خود اپنے آپ کو ٹھگا۔ یعنی پندرہ ہزار کی لکڑی خریدی اور رسید بیس ہزار کی بنوائی۔ اب وہ پندرہ ہزار کی لکڑی جب احسان صاحب وصول کرنے گئے تو انہوں نے دس ہزار کی لکڑی لدوائی، باقی پانچ ہزار کی لکڑی چار ہزار

میں واپس کر دی - ایک ہزار دکاندار کو بچے - یہ لکڑی اسٹوڈیو لائی گئی - اب معلوم کیا گیا کہ کس کس کو لکڑی چاہیے - چپکے چپکے وہ دس ہزار کی لکڑی ادھر اُدھر بارہ ہزار میں کھپا دی گئی - سیٹ کے لیے تھوڑی سی رکھ لی - احمد بھائی چیک کرنے آئے تو کسی کا بھی کام چالو ہؤا ، وہی دکھا دیا - مستری نے بھی ہاں میں ہاں ملا دی -

یہی کاسٹیوم کے معاملے میں ہؤا کرتا ہے - یار دوستوں سے کپڑوں کے کیش میمو جمع کر لیے اور دکھا دیے سیٹھ کو - یہی پھر انکم ٹیکس میں کام آئیں گے - ویسے سیٹھ زیادہ چالاک ہو تو دکاندار سے معاملہ فٹ کرنا پڑتا ہے - تین ہزار کے کپڑے کا بل وہ چار ہزار بنا دے گا — پانچ سو آس کے اور پانچ سو آپ کے - بعض سیٹھ بڑا چالاک ہوتا ہے ، وہ اس بات پر مصر ہوتا ہے کہ سارا کپڑا اس کے چاچا کی دکان سے خریدا جائے اور ماما کی دکان سے سلوایا جائے ، تاکہ بے ایمانی کی گنجائش ہی نہ رہے - اب اگر سیٹھ پھنس چکا ہے اور آس کا روپیہ لگ گیا ہے تو بس ہر کپڑے کو کیمرہ مین سے مل کر رد کروا دیجیے :

” نہیں صاحب یہ نہیں چلے گا — چاکی ہو جائے گا - “ کیمرہ مین کہہ دے تو سیٹھ بے بس ہو جائے گا - حالانکہ

چالیس فی صدی سود لے رہا ہے پھر بھی سیٹھ چاہتا ہے جتنا پیسہ دیا جائے وہی اس کا منافع ہے ۔ وہ اس فلم کی گردن میں ہر خرچ باندھنا چاہتا ہے : اپنے نوکروں کی تنخواہیں ، بال بچوں کا خرچہ ، گھر میں آفس کے بہانے کرایا ، سیر و تفریح کا سارا خرچ ، اپنی داشتاؤں کے لاڈ پیار کا خرچ ۔

ادھر پروڈیوسر بھی اسی چکر میں ہے کہ جو ہاتھ آ جائے پھر کون دیتا ہے ؟ ڈسٹری بیوٹر تو سوائے زبردست ہٹ کے کسی فلم میں منافع نہیں دکھاتا ۔ ظاہر ہے جب ایک فلم پر اتنے گدھ منڈلا رہے ہوں تو وہ کس قسم کی بنے گی ۔ ریلیز ہو کر پہلے ہفتے میں ٹھپ ہوجائے گی ، ساتھ ساتھ پروڈیوسر اور فنانسر بھی ٹھپ ۔

بڑی مشکل سے گھنٹوں سر کھپانے کے بعد احمد بھائی کو شیشے میں اتار لیا گیا ۔ طے ہؤا کہ ادھر وہ دو گانے ریکارڈ کروائیں آدھر معصومہ آن کی ۔

یہ دونو گانے کریڈٹ پر ریکارڈ ہو رہے تھے ۔ آشا بھونسلے کے ہاتھ پیر جوڑے تو وہ اس شرط پر تیار ہو گئی کہ بمبئی کی ٹیری ٹری سے ادائیگی ہو جائے گی ۔ اسٹوڈیو اور خام مال تیس فی صدی سود پر ملا ہی ہؤا تھا ۔ میوزیشن بھی کریڈٹ دینے پر تیار ہوگئے ۔ لیجیے گانے ریکارڈ ہوگئے ۔

بیگم ساری رات بالکنی میں ٹہلتی رہیں ۔ حامی تو بھر لی ، مگر ہوگا کیسے؟ براہِ راست معصومہ سے دھڑ سے کہہ دیں؟ منہ نہیں پڑتا ۔ کئی بار چاہا آسے جگا کر سینے سے لگائیں اور سمجھائیں — مگر کیا سمجھائیں؟ ساری عمر تو یہی تلقین کی : ” بیٹی ! عورت کا زیور آس کی عزت ہے ۔ جان جائے پر عصمت پر بال نہ پڑے ۔“ آج اس سے کیوں کر کہیں کہ اب تیرے سوا زندگی کا اور کوئی سہارا نہیں ؟ تجھے قربانی دینا ہوگی ، چھوٹے بہن بھائیوں کی ناؤ پار لگانے کے لیے پتوار بننا ہوگا ۔

نہیں ، یہ آن سے نہ ہوگا ۔ روتے روتے صبح ہو گئی ۔ دور کرشنا مل کا پھاٹک کھل رہا تھا اور رات پالی کے مزدور چوسی ہوئی گنڈیریوں کے پھوک کی طرح مَرے قدموں سے نکل رہے تھے ۔ تازہ دم بوڑھے ، جوان لانگ کسے اور عورتوں کے ہنستے ہوئے غول پھاٹک میں داخل ہو رہے تھے ۔ صبح کی سفید روشنی میں سیاہ سڑک پر پڑے ہوئے چاٹ کے کاغذ اور پتے کوڑھ کے داغوں کی طرح آبھر رہے تھے ۔ ایک چھلا ہؤا کسیرو جیسا کتا کھمبے پر ٹانگ آٹھا کر مُوت رہا تھا ۔

وہ پلٹ کر کمرے میں آ گئیں ۔ معصومہ پر بے اختیار نظریں جم گئیں : کیا بے سدھ میٹھی نیند میں غرق تھی ۔

اُلجھے ہوئے بالوں سے آدھا منہ ڈھکا تھا۔گلابی ہونٹوں کے درمیان آگے کے دو دانت چمک رہے تھے۔ قمیص کا گھیر پہلو تلے دب کر گلا کھنچ رہا تھا۔ جھک کر اُنہوں نے اُس کے گریباں کے بٹن کھول دیے۔ ایک دو تین — سفید سفید، بھولا بھولا کنوارا سینہ نہ جانے کن پیار بھرے سپنوں کی دھڑکن سے لرز رہا تھا!

وہ پٹی سے لگ کر کھڑی دھاروں دھار روتی رہیں۔ بمبئی کا جلد باز سورج کھڑکی سے جھانکا۔کھڑکی میں پڑا ہؤا چیتھڑا ہلا اور جیسے دودھ پر کوڑیالہ سانپ لہرانے لگا۔ سہم کر اُنہوں نے بچی کو چادر سے ڈھک دیا۔

دوسرا باب

کیا دھوم دھام تھی۔ تین بیٹوں پر بیٹی ہوئی تھی — نازک سی۔ پیٹ میں تھی تب ہی اندازہ ہو گیا تھا، کیونکہ پیٹ بیٹوں کی دفعہ چھاتی تک چڑھ آتا تھا۔ معصومہ نازک چڑیا سی پیٹ میں معلوم بھی تو نہ ہوتی تھی۔ ذرا سا دودھ پی کر پیٹ بھر جاتا تھا۔ ھڑا بھی الغاروں دودھ تھا۔ جو ماں کے دودھ زیادہ آترے تو کہتے ہیں بچہ بڑا خوش نصیب ہوتا ہے — روپے کی افراط رہتی ہے۔ نجومی نے پیشانی دیکھ کر کہا تھا: بڑی طالع ور بچی ہے۔ بڑی برکت لائے گی۔ دروازے پر ہاتھی جھومے گا۔ ہاتھی! احمد بھائی تو بالکل خچر تھے!

تیرویں برس سے پھول پہنے، تبھی سے پیغام برسنے لگے۔ بڑے بڑے نوابوں کے پیغام۔" اُنہہ، یہ نواب نکمے ہوتے ہیں۔ کسی آئی۔ سی۔ ایس سے کریں گے اس کا بیاہ۔" مبارک تو ثابت ہوئی نگوڑی: آسی مہینے ترقی ہوئی۔ سال بھر کی تھی تو خطاب مل گیا۔ فوج کی کمان مل گی۔ حضور سرکار کی عنایات کی بارش ہونے لگی۔

نو دن پہلے نوبت رکھواؤں گی۔ بالکل پرانی شان سے

شادی ہو گی ۔ نو دن مانجھے بٹھائی جائے گی ۔ دلی کا اُبٹن مشہور ہے ۔ مہندی گھر کی جھاڑی سے نکلے گی ۔ دادا ابا نے پوتی کے سہاگ کے لیے قلم لگائی تھی ۔ اب تو سارے برآمدے کے لیچڑے پھیل گئی تھی ۔ عید بقر عید کو لڑکیاں بالیاں مہندی سونتنے لگتیں تو جی ڈرتا تھا کہ کہیں مرُدیاں جڑ نہ ہلا دیں ۔ بڑوں کے ہاتھ کی لگائی مہندی ہے ، شادی تک رہ جائے تو جانو ۔

مگر پولیس ایکشن کے زمانے میں جب تن بدن کی سدھ نہ رہی تو سارے ہی پیڑ سوکھ گئے۔ کوٹھی تین مہینے ڈھنڈار پڑی رہی ۔ جڑوں میں دیمک لگ گئی ۔ جب پرانا سامان نکالنے گئیں تو جہاں مہندی لہرایا کرتی تھی ادھر غسل خانہ کی نیو پڑ رہی تھی ۔ مہندی کا سوکھا جھاڑ کوڑے پر پڑا تھا ۔ ہاتھ لگاتے ہی پتیاں جھڑ جھڑ بکھر گئیں ۔ جی دھک سے ہوگیا ۔ ایسی ارمانوں کی مہندی جل جائے ، یہ کوئی اچھا شگن نہیں ۔ شادی میں برات کو سات کھانے دینے کا ارادہ تھا ۔ پلاؤ ، قورمہ ، تندوری ، مرغ شکم پور، شاہی ٹکڑے ، سیخ کباب — اور — اور — انہیں کھانوں کے گرم گرم بھبکے آنے لگے ۔ شام کو سب نے مسکہ پاؤ کے ساتھ چائے پی لی تھی ۔ مال کی پکی وصولی سے پہلے احسان صاحب کوڑی کا اعتبار کرنے کو تیار نہ تھے۔

وہ تو ایرانی ریستوران کا مالک اب تک مہربان تھا ۔ قرض مع سود ایک دن وصول ہو جائے گا ۔ جب کسی پیڑ میں پکے پکے پھل جھول رہے ہوں تو پاس پڑوس والے لوٹا بھر پانی سے اُس کی جڑ سینچ دینے میں تکلف نہیں کرتے !

بکرے کی ماں کب تک خیر منا سکتی تھی ؟ آخری دن بھی آ ھی گیا ۔ اسکیم کے مطابق سلیم اور دونوں لڑکیوں کو انہوں نے سرِ شام ھی سے احسان صاحب کے ھاں بھیج دیا تھا ، جہاں احسان صاحب کی رائے کے مطابق اُن کی بیٹیوں نے رات کو انہیں روک لیا ۔ معصومہ بھی جانے کو ضد کرنے لگی ، مگر بیگم نے جل کر آسے ڈانٹ دیا ۔ سارا واقعہ ایک اتفاق معلوم ہو ، اس لیے معصومہ سے اچھے کپڑے پہننے کو بھی نہ کہا ۔ ویسے قاعدے سے لوگ قربانی کے بکرے کو بھی ھار پھول پہناتے ھیں ۔ شام کو جب احسان ، احمد بھائی کے ساتھ داخل ہوئے تو بیگم کو پسینے چھوٹ گئے ، جیسے بیٹی کے بجائے خود آن کی عزت پر شہ پڑ رہی ہو ۔

تھوڑی دیر ادھر اُدھر کی گپ شپ ہوتی رہی :

” انڈسٹری کا پائیہ گل ہو رہا ہے ۔ ایک پروڈیوسر کو ایکسٹرا آرٹسٹوں نے مارتے مارتے چھوڑا ۔ کاسٹیوم انچارج نے کپڑے چرا کر بیچ دیے ۔ اُس کا سال بھر کا پیسہ مار

لیا تھا ۔ اب تو سوائے ہیرو ہیروئن کے یا آن کے چیلے چپاٹوں کے کسی کی دال فلم لائن میں نہیں گلتی ۔ اب تو ڈسٹری بیوشن بھی یہی لوگ سنبھالتے جا رہے ہیں ۔ پھر ایک دن ایسا آئے گا جب سینما حال بھی یہی خرید لیں گے ۔''

'' پھر ہال میں فلم بھی یہی لوگ دیکھیں گے ۔ ''
بیگم نے بات میں بات جوڑی ۔

'' ہاں صاحب یہی ہوگا ۔''

مگر احمد بھائی آمدم برسر مطلب کے منتظر بیٹھے پہلو بدل رہے تھے ۔ انہیں اس ٹال مٹول سے جھلاہٹ چڑھ رہی تھی ۔ خوب پیے ہوئے تھے ، اس پر بھی بار بار جیب سے فلاسک نکال کر ، پیٹھ موڑ کر ، چسکی لگائے جا رہے تھے ۔ معصومہ '' ٹرو اسٹوری '' کا ایک پرانا پرچہ لیے دھندلے بلب کی روشنی میں اوندھی پڑی تھی ۔ احمد بھائی کو جیسے چل ، ہو رہی تھی ۔ کبھی گدی کھجاتے ، کبھی مونچھیں ٹٹولتے ، کبھی رانوں میں سلسلاہٹ ہونے لگتی ۔ آن کی آنکھوں کی پتلیاں ٹھوکریں کھا رہی تھیں ۔ بیگم ایک ایک سیکنڈ ٹال رہی تھیں ، جیسے ڈاکٹر کا نشتر ان پلوں میں کند ہی تو ہو جائے گا ، یا کہیں آسمان سے ان کے سارے دکھوں کی دوا ٹپکنے لگے گی ۔ مگر کب تک؟ احمد بھائی زور زور سے احسان صاحب کی پسلیوں میں کہنیاں مار رہے تھے ۔ وہ

ٹھنڈی سانس بھر کر اُٹھیں ۔ ایک بار جی چاہا آس کے منہ پر تھوک دیں : ''حرام زادے تیری بھی تو کنواری بیٹیاں ھیں ، جا اُن پر ایک نظر ڈال آ ۔ وہ ، جن کے جہیز کے لیے تو نے الماریاں بھر رکھی ھیں ۔ کیا یہ روپیہ اُنھیں الماریوں میں سے نکال کر میری معصومہ کو خریدنے آیا ھے ؟ جیسے وہ بھی آٹے کی بوری ھے ، بسا گھی کا کنستر ھے ۔'' مگر پانی سر سے گزر چکا تھا ۔ ڈوبتے ڈوبتے اُبھر کر اُنھوں نے کہہ دیا :

''میں ابھی آئی — ذرا لکشمی بائی سے تھوڑے سے پاپڑ لے آؤں ۔'' باورچی کو پہلے ھی چھٹی دے دی تھی ۔ معصومہ کو شبہہ بھی نہ ھؤا اور وہ چلی گئیں ۔

'' بھئی میری ریکارڈنگ کی ڈیٹ ھے ، کوئی گھنٹہ بھر سے آجاؤں گا ۔'' اُنھوں نے معصومہ کو سنانے کے لیے اُونچی آواز سے کہا ، '' احمد بھائی تم بیٹھو ۔ لڑکی اکیلی ھے ، بیگم آجائیں تو تم بھی آجانا ۔ ذرا ڈانس کا گانا سننا ۔ کیا شمشاد نے گایا ھے ۔ قسم سے نوشاد کی ٹیون کچھ بھی نہیں اس کے آگے ۔ بڑی دھانسو ٹیون ھے ۔ تھیم سونگ ھے ۔ جب ھیرو موٹرکار سے زخمی ھو جاتا ھے تو یہی ٹیون سیڈ ھو جاتی ھے ۔ پھر ڈریم سونگ میں اسی ٹیون کو والز میں بنوا رھا ھوں ، دوگانے کے لیے ۔ پھر کمال دیکھیے یہی ٹیون جب

ہیروئن کے بچہ کو بخار آجاتا ہے تو لوری کی طرح ...،،

،، ہاں ہاں جانتا ہے بابا ۔ جاؤ نا! اب بے ناحق کو کھوٹی کرتا ہے ۔،، احمد بھائی بے قرار ہو کر بولے ۔

،، اچھا اچھا ۔،، احسان بھائی پر اوس پڑ گئی ۔ وہ بھی چلے گئے ۔

پھر ایسا معلوم ہؤا جیسے گھر میں کوئی نہیں ۔ پورے محلے میں کوئی نہیں ۔ بمبئی میں کوئی نہیں ۔ دنیا میں کوئی نہیں ! صرف دھندلے مکھیوں کے گو میں سنے ہوئے بلب کی روشنی میں جھکی ہوئی بے خبر معصومہ اور خارش زدہ احمد بھائی ۔

دور کہیں کسی زخمی پلے کے کسی نے ٹھوکر ماری اور وہ ٹیاؤں ٹیاؤں کرتا گٹر میں گھس گیا ۔ بیگم سر جھکائے تیز تیز بس اسٹینڈ کی طرف جارہی تھیں ۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو اُبل کر راستہ انجان بنا رہے تھے ۔ کسی نے اندھیرے میں اُن کے آنسو نہ دیکھے ۔

بس سے اُتر کر بیگم دیر تک دادر کی چھوٹی چھوٹی دکانوں پر چٹ پٹ خریدتی رہیں ۔ پھر خدا داد سرکل کے دو چار چکر لگائے ۔ سوچا : براڈوے سینا میں شو ہی دیکھ ڈالیں ۔ مگر ایک دم ایسی وحشت ہوئی کہ پھر لوٹ پڑیں ۔ شیواجی پارک میں لاتعداد جوڑے ساتھ ساتھ ٹہل رہے تھے ۔ سامنے کیڈل کورٹ کے آگے کچھ غنڈے ڈھول کی تھاپ

پر پواڑا گا رہے تھے۔ وہ سیدھی سمندر کی ریت پر نکلی چلی گئیں۔ ٹھنڈی ریت پر بیٹھ کر نہ جانے کیوں وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

سامنے سمندر سسکیاں بھر رہا تھا۔ پانی دھیرے دھیرے لوٹ رہا تھا۔ وہ روتی رہیں۔ آس پاس لوگ ہولے ہولے باتیں کرتے ٹہل رہے تھے۔ کبھی کوئی روپہلا قہقہہ فضا میں چھنک کر کسی بھاری آواز میں ڈوب جاتا۔ انہوں نے دونوں مٹھیوں میں ریت بھینچ کر چیخوں کو گھونٹ دیا۔

وہ کتنی اکیلی تھیں؟ دنیا میں کسی کو بھی احساس نہ تھا کہ وہ اکیلی ہیں۔ دنیا ان کو بھول چکی تھی۔ نواب صاحب نے کن ارمانوں سے ہاتھ پیر جوڑ کر ابا سے انہیں مانگا تھا۔ کبھی روکھی بات نہ کی۔ سچ مچ پھولوں میں تول کر رکھا۔ کیا گرما گرم پیار تھا! کتنی حسین جوانی تھی! میٹھی میٹھی نیند آنکھوں میں کھٹک رہی ہے اور جگائے چلے جاتے ہیں۔ سر کی قسمیں دی جا رہی ہیں۔ آج جب معصومہ کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا ہے وہ شاید کمسن دلہن کو پہلو میں دبائے سو رہے ہوں گے۔

ایک دم غصے کا طوفان ان کے سینے میں جاگ اٹھا۔ بٹوے میں نوٹ سرسرانے لگے۔ لعنت ہو نکاح پر! کیا دھرا ہے نکاح میں؟ ان کا نکاح بھی تو بڑے قاضی صاحب نے

پڑھایا تھا ، جو ایک بوڑھے رئیس کے لا تعداد نکاح پڑھا چکے تھے ۔ آج وہ نکاح ریت کے ذروں سے بھی زیادہ بے حقیقت ہو چکا تھا ۔

لوگ آہستہ آہستہ جا رہے تھے ۔ دو چار موالی دیر سے آن کے ارد گرد منڈلا رہے تھے ۔ ایک دم سے کلیجہ دھک سے ہو گیا ۔ یہ کیا حماقت کی انہوں نے ! روپے ساتھ لیے پھر رہی ہیں ۔ ایک دو نہیں پورے پانچ ہزار ۔ انہوں نے ہتھیلیوں پر سے ریت جھاڑی ۔ وہ گھر کی طرف ہو لیں ۔ جب گھر پہنچیں تو ساری بلڈنگ میں اندھیرا ہو چکا تھا ۔ فٹ پاتھ پر ننگی ٹانگوں کی قطاروں کو پھلانگتی وہ تیز قدم چلیں ۔

ہلکی سی ایک چیخ کی آواز سنائی دی اور اندھیرے سے معصومہ نکل کر آن سے چمٹ گئی ۔

" امی! امی جانی ! میری امی جانی ! " آس نے کانپتے ہوئے جسم کا سارا بوجھ آن کے ہاتھوں میں سونپ دیا ۔ ستاروں کی ملگجی روشنی میں انہوں نے دیکھا : معصومہ کا گریبان تار تار تھا ۔ ساڑھی میں بھنباقے ہو رہے تھے ۔ بال نچے ہوئے تھے ۔ اس کی سفید ریشمی گردن پر کھرونچوں کے نشان تھے ۔ ایک کان کی لو سے خون بہہ کر جم گیا تھا ، جیسے آسے بھوکے کتوں نے بھنبھوڑا ہو ۔ وہ

آسے کلیجے سے لگا کر سو کھی سو کھی ہو گئیں ۔ اپنے سارے منصوبے بھول گئیں ۔ انہوں نے سوچا تھا وہ آسے ڈانٹیں گی ۔ گالیاں دیں گی ۔ بدمعاش اور لفنگی کہیں گی ، تاکہ وہ اپنی شرافت کا بھرم قائم رکھ سکیں ، اپنے حرم پر پردہ ڈال سکیں۔ بات حادثہ بن جائے ۔ مگر آنہیں کچھ بھی نہ یاد رہا ۔ جب اندر پہنچ کر آنہیں معلوم ہوُا کہ معصومہ صاف بچ نکلی ، آس نے احمد بھائی کا بھرتا نکال دیا ، تو وہ سناٹے میں رہ گئیں ۔

سارے فلیٹ میں ایسا معلوم ہوتا تھا گھوڑے دوڑ گئے ہیں ۔ پانی کے سارے گھڑے چکنا چور تھے ۔ گلاس لڑھکے پڑے تھے ۔ چائے کا سیٹ چورا ہوچکا تھا ۔ الگنی کے کپڑے کیچڑ میں پڑے تھے ۔ کھڑکیوں کے شیشے کرچی کرچی ۔ مارے غصے کے آن کی آنکھوں میں خون آتر آیا ۔ ایک زور کا طانچہ انہوں نے معصومہ کے گال پر مارا ۔

” چڑیل ! کتیا !“

” امی — وہ بدمعاش ...“ معصومہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا ۔

” چپ بدمعاش کی بچی ۔ غضب خدا کا گھروا کر کے رکھ دیا ۔ اب تیرے باوا بھریں گے ۔ “ انہوں نے بٹوہ دونوں ہاتھوں سے کلیجہ سے لگا لیا ۔ ”یا پروردگار مجھے موت

کیوں نہیں دیتا ؟ یہ چار چار میتیں میری چھاتی پہ دھری ہیں ۔ اوپر سے کرتوت تو دیکھو ۔ حرامزادی — چھنال —''

وہ معصومہ پر ٹوٹ پڑیں ۔ وہ ماں جس نے گھڑی بھر پہلے اپنی بچی کی سلامتی پر آسے کلیجے سے لگایا تھا ، نوٹوں کی سرسراہٹ سے سہم گئی ۔ کل روپے واپس کرنے ہوں گے !

انہوں نے معصومہ کا کوئی عذر نہ سنا ۔ وہی پھٹے پرانے بھیگے چیتھڑے پہنے وہ چٹائی پر جھکی ہوئی سسکیاں بھر رہی تھی ۔

صبح تڑکے احسان صاحب کو دیکھ کر وہ ایسے لرزیں جیسے قصائی کو دیکھ کر گائے ۔ مگر وہ بڑے پیار سے مسکرا کر پاس بیٹھ گئے ۔

'' ابھی احمد بھائی کے پاس سے آ رہا ہوں ۔ عجیب آلو کا پٹھا ہے ۔ سالے کو میں نے بڑی ڈانٹ پلائی ۔''

چپ چاپ بیگم نے نوٹوں کی گڈی نکال کر احسان صاحب کے آگے پھینک دی ۔ '' ارے یہ کیا ؟'' وہ بڑی نرمی سے بولے اور روپے گننے لگے ۔ '' اب اس میں ہمارا کیا قصور ہے ؟ سالا بالکل ہی اناڑی ہے ۔ اصل میں بہت پی گیا تھا ۔ میں نے سسرے کو بہت ڈانٹا ۔ وہ تو کہو اپنا فلیٹ پچھلی طرف ہے اور پاس والے فلیٹ والے ناسک گئے ہوئے ہیں ، اگر کسی کو خبر ہوجاتی تو کمبخت جیل میں دھرا ہوتا ۔''

وہ روپیوں کو سہلانے لگے ۔ پھر روپے آن کی طرف کھسکا دیے ۔ '' پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ۔ نا سمجھ ہے ابھی ۔ راہ راست پر آ جائے گی ۔ تم ماں ہو ، سمجھا بجھا سکتی ہو ۔''

گلا نہ بھر آیا ہوتا تو بیگم کہتیں کہ کیا سمجھاؤں ؟

'' خدا قسم رو کیوں رہی ہو ؟ مکان والے سے میں نے کہہ دیا ہے ، وہ دوپہر کو آئے گا کرایہ لینے ۔ دو چار کپڑے لتے تو بنوا دو ۔ ایسا کرو ، مارکٹ چلی جاؤ ۔ مول چند کے ہاں میرا اکاؤنٹ کھلا ہؤا ہے ۔''

تو احمد بھائی ناراض نہیں ۔ بلکہ آنہیں تو چھوکری کی یہ ادا بے حد بھائی ۔

'' کسم سے کیا دنگائی چھوکری ہے ۔'' انہوں نے اپنی سوجی ہوئی ناک پر برف کا ٹکڑا رگڑ کر کہا ۔ ان کے بھی سارے کپڑے تار تار ہو چکے تھے ۔ پھر بھی آن کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں ۔ '' کیا سالی ایک دم ہرنی کا مافک ہے ۔''

'' پر سیٹھ اتنا پی کر بچی کو ہلکان کرنا کہاں کی انسانیت تھی ؟ ''

احمد بھائی ہیں ہیں کرنے لگے ۔

'' آج جوہو لے جاوے ؟ بابا آس فلیٹ میں اپنے کو ایک دم نہیں چلے گا۔''

'' آج نہیں۔''

'' کائیکو ؟ ''

'' بس ایسے ہی۔''

'' کیا بات کرتا ہے تم؟ سالہ پانچ ہجار لیا — اور ...''

'' میرے کھاتے میں ڈال دو۔''

'' تمھارا کھاتا میں ؟ ''

'' ہاں — پرسوں تک سورج مل سے دلوا دوں گا۔ کیا سمجھتے ہو بس سارے بمبئی میں تم ہی ایک لکھ پتی ہو؟''

'' ارے وے تم کیا بنڈل مارتا — ہم کب بولا ؟ ''

'' سیٹھ سچی بات سنو گے ؟ ''

'' بولو۔''

'' یہ لونڈیا جو ہے نا۔''

'' ہاں !''

'' وہ تمھارے بس کی نہیں۔''

'' کائیکو ؟ ''

'' اماں گاوڈی ہو نرے۔ چھٹانک بھر کی لونڈیا نے مار مار کے بھوسہ بھر دیا۔''

'' نئیں نئیں ایسا بات نہیں۔ بابا ہم نیٹ پیے لا تھا۔

ایک دم نیٹ ۔ ہمارے کو کچھ دکھائی نہیں پڑا ــ اور چھوکری سالا اتنا مست کہ کیا بولے تم سے ۔ ہم جرا ہاتھ لگایا کہ مارا ماری کرنے لگی ۔''

'' سوچ لو ۔''

'' بس آج جوہو ۔''

'' اماں کیا آلو کا پٹھا پن کیے جا رہے ہو ؟ ''

'' کائیکو ؟ ''

'' ایکساں طوطے کی طرح جوہو کی رٹ لگا رکھی ہے ۔ اچھا ایسا کرو ، وہ فلوری ہے نا ۔''

'' ہم سے سالہ فلوری کا بات مت کرو ۔ کیسا تھرڈ کلاس چھوکری ۔ تم کیا سمجھتا ہے ہمارے کو ؟ ''

'' اچھا بابا بگڑتے کیوں ہو ۔''

'' بگڑے کاہے کو نہیں ۔ پانچ مجار دیا ۔ کوئی کمتی ہے ؟ ''

'' اماں تو اب میں کیا کروں؟ لونڈیا کے ہاتھ پاؤں باندھ کر پکڑا دوں ؟''

'' نئیں ایسا کب بولا ہم ۔ پن جرا بولو نا چھوکری کو ۔ ایسا مارا ماری ایک دم نہیں چلے گا ۔

'' پھر وہی مرغ کی ایک ٹانگ ۔''

'' مرگا ؟ کون سا مرگا ؟ ''

'' تمھارا باپ ! '' احسان بھائی نے چڑ کر دو چار موٹی موٹی گالیاں ٹکائیں ۔

'' سنو ۔'' احمد بھائی بڑے لاڈ سے بولے ۔

'' کیا ؟ ''

'' تمھارے کو ککو کا ڈانس مانگتا پچر میں ؟ ''

'' ککو کا ڈانس ھوگا تو پکچر شرطیہ ھٹ سمجھو ۔''

'' تو پھر ایسا کرو تم لیو سالہ ڈانس ۔ ایک نہیں دو لیو ۔''

'' مطلب ؟ ''

'' ارے مطلب کیا ۔ کچھ بھی نہیں ۔ ھم کیا بولا ؟''

سیٹھ ھنسے ۔

'' جوھو ؟''

سیٹھ نے دانت نکوسے ۔

'' ھوں ۔ '' احسان میاں لاپروائی سے سگریٹ سلگانے لگے ۔ مگر احمد بھائی پر تو معصومہ کا بھوت سوار تھا ۔

'' بات کروں گا آج ۔''

'' کیا سالہ تم اتنا دن سے بات کرتا ، بات کرتا ۔ '' احمد بھائی چراغ پا ھو گئے ۔ '' ایک دم چار سو بیس ھے تم ! ''

'' دیکھو سیٹھ ! ''

" کیا ؟ "

" جوتے کھانے کی باتیں توکرو مت ۔" جب سے سیٹھ پر معصومہ کا عشق سوار ہؤا تھا احسان صاحب بڑے گستاخ ہوگئے تھے ۔ انہیں معلوم تھا سیٹھ بڑا چغد ہے ، ایک بات کی دھن ہو جائے تو پھر ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے کسی طرح نہیں ٹلے گا ۔

" ہاں خوب یاد آیا ــ وہ مگن لال ڈریس والا کا بل پڑا ہے ۔"

" کوئی واندا نہیں ــ کل دے گا چیک ۔ ہم ناں کب بولا ؟"

" وہ مول چند کو فون کر دیجیے گا ۔"

" مول چند ؟ ہم کل اس کو چیک دیا ۔ بابا تم ہمارے کو کھلاس کر دے گا ۔ ہم ..."

" افوہ ــ کس چغد سے پالا پڑا ہے ۔ اماں یار پکچر کے لیے نہیں ۔ بیگم کہہ رہی تھیں کہ لڑکیوں کے پاس کپڑے نہیں ۔ میں نے باندرہ میں بنگلہ کا انتظام بھی کر لیا ہے ۔"

" اچھا ــ تو ایسا بولو نا ۔ سیٹھ ہنہنائے ۔ ہم شام کو ساڑھی پہنچا دے گا اور مول چند کو بھی فون کر دے گا ــ پن جوہو ۔"

'' اچھا بابا جوہو بھی جائے گا ۔''

بیگم نے نوٹوں کا بنڈل واپس اٹھایا تو کچھ ہلکا لگا ۔ گنا تو تین ہزار !

'' اگلے ہفتے دے دوں گا ۔ فلم کی ڈلوری دینی ہے ۔'' احسان صاحب مسکرائے ، مگر بیگم سمجھ گئیں کہ وہ اپنا کمیشن لے گئے ۔

'' مگر ...''

'' کیوں گھبراتی ہو ؟'' انہوں نے بالکل شوہرانہ انداز میں کہا ، '' شام کو ساڑھیوں والا آ رہا ہے ۔''

'' آپ کو ساڑھیوں کی پڑی ہے ۔ یہاں ہزار خرچ جان کو لگے ہیں ۔''

'' تم دیکھتی جاؤ — اللہ کارساز ہے ، سب کچھ ہوجائے گا ۔ ہاں بھئی وہ بنگلے کا میں آج طے کر آؤں گا ، کب تک شفٹ کر سکو گی ؟''

'' مجھے کون سے سامان سمیٹنے ہیں ۔ نیا سیٹ وہیں جا کر خریدنا پڑے گا ۔''

'' کیوں خریدتی ہو ؟ میرے پچھلے محل والے سیٹ کا پورا فرنیچر پڑا ہوا ہے ۔ الٹرا ماڈرن ہے ۔ سیٹھ سے کہہ دوں گا ، وہ یہاں لا کر جا دے گا ۔''

" مگر ..."

" کیا مگر ؟"

" معصومہ !"

" نا سمجھ ہے ، رسانیت سے سمجھانا ہوگا ۔"

سمجھانا ہوگا ؟ وہ کیسے سمجھائیں گی ؟ لڑکی بالغ ہوئی تو مارے شرم کے انہوں نے بات بھی نہ کی ۔ باقری بوا سے کہا ۔ آنہیں نے پالا تھا ، آنہیں نے سمجھا دیا ۔

باقری بوا ! آف ! اچھا ہؤا جو آنکھیں مند گئیں ۔ ہر وقت پیچھے پڑی رہتی تھیں :

" اے پاشا دوپٹہ سر کو ڈالو ، یوں ننگے سر پھرتے شریف بہو بیٹیاں ؟"

کیا مجال جو کوئی لڑکی اونچی آواز سے بول جائے :

" ہائے پاشا غیر مرداں کو کاناں میں آواز جاتا ۔ چپکا بولو بیٹے !"

وہ ہوتیں تو؟ نہیں ، باقری بؤا نہیں — نوابی شان نہیں — کچھ نہیں — کوئی نہیں !

معصومہ بانو منہ پھلائے بیٹھی دائیں ہاتھ کی چھنگلی کے ناخن پر سے کیوٹکس کھرچ رہی تھی ۔ احمد بھائی دو چار دن کے لیے سورت گئے ہوئے تھے ۔ وہاں سے لوٹے تو آنکھ کی سوجن آتر چکی تھی ۔ ناک پر بھی کھرنڈ آگیا تھا اور وہ

اس وقت امی کے پاس بیٹھے فرنیچر کی فہرست بنا رہے تھے ۔ آسے دیکھ کر انہوں نے نہایت بے حیائی سے دانت نکوس دیے ۔ وہ بھنائی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی آئی ۔ ٹرک آیا تو گھر کا کوڑا کرکٹ لادا گیا ۔ احمد بھائی کی موٹر میں سب بیٹھے ۔ انہوں نے آسے آگے اپنے پاس بٹھانا چاہا مگر وہ تنک کر دور جا کھڑی ہوئی ۔ بیگم ہنس پڑیں اور سلیم کو آگے بھیج کر آسے پاس بٹھا لیا ۔

” کیا بدتمیزی ہے ؟ “ انہوں نے پیار سے اس کی لٹ سنوارتے ہوئے کہا ۔

” اُنہہ ! “ عاجز ہو کر آس نے آن کا ہاتھ جھٹک دیا ۔

” قسم خدا کی ایسا طمانچہ مارا ہوگا کہ دانت جھڑ جائیں گے ۔ سر پر ہی چڑھی جاتی ہے سورنی ۔ “

بنگلے میں سامان آتر رہا تھا تو معصومہ ایک طرف بے تعلق سی کھڑی ہوگئی ۔

” بھول ہوئی بابا — معاف کر دو ۔ “ احمد بھائی پاس آ کر بولے ۔

” ہنہ ! “ معصومہ نے ناک سکیڑی ۔

” بولو تو آٹھک بیٹھک کرے ۔ ناک پکڑ کر تین سلام کرے ۔ ہمارے سے غلتی ہو گیا ۔ لو کان پکڑتا ہے ہم ۔ “ انہوں نے دونوں کان پکڑ کر کہا ۔ معصومہ کو ہنسی

آ گئی ۔ نہ جانے آن کی گھگو جیسی صورت پر یا اپنی بےکسی پر ۔ بیگم نے بھی سمجھایا :

” کتنا کچھ کر رہے ہیں اپن لوگوں کے لیے ۔ ڈھائی سو ہے کرایہ اس بنگلے کا ! “

” تو وہیں چلیے نا ، وہاں ستر روپیہ تھا ۔“

” ہوں! اور وہ ستر کون دے گا ؟“ انہوں نے سمجھایا اور معصومہ نے سمجھ لیا ۔ آس کا غصہ آڑن چھو ہو گیا ۔ پھر وہی ہنسی مذاق اور قہقہے گونجنے لگے ۔ خوبصورت کپڑوں اور زیورات کا کس بچی کو شوق نہیں ہوتا ؟ اپنی سکت بھر آس نے مدافعت کی ، پھر بھول گئی ۔ اتنی ننھی نہ تھی کہ اپنی ہستی کا مول نہ جانتی ۔

اور پھر ایک دن احمد بھائی کے دام وصول ہو گئے ۔ اور معصومہ بانو نیلوفر بن گئی ۔ اور بیگم کی نوابی لوٹ آئی ۔ وہی کھانے پینے کی ریل پیل ۔ قدم قدم پر نوکر ۔ سلیم میاں کا نام فوراً بڑے شاندار اسکول میں لکھوا دیا گیا ۔ موٹر چھوڑنے اور لینے جاتی ۔ بیگم وہی صبح گیارہ بجے سو کر آٹھنے لگیں ۔ جیسے برا خواب دیکھا تھا ، آنکھ کھلی تو کچھ بھی نہ بگڑا تھا ۔ صرف نواب نہ تھے ۔ تو ناز برداریوں کو احسان صاحب کیا کم تھے؟ اب تو وہ بقول کسے کھیتی کاٹ رہے تھے ۔ اتنے سال جتنا گہرا کنواں کھودا تھا اتنا

ہی میٹھا پانی پی رہے تھے ۔ پہلے تو بیگم کا کچھ بار ان پر بھی پڑ جاتا تھا ، مگر اب تو دونوں وقت کا کھانا بندھا تھا ۔ اُن کی بیوی اور بیٹی سے بھی میل جول شروع ہو گیا تھا ۔ انہیں بھی اب یقین ہو گیا تھا کہ احسان صاحب کے بیگم سے صرف ایسے تعلقات تھے جیسے ایک بدنصیب عورت کے شوہر کے عزیز دوست کے ہونا چاہیں ۔ انہوں نے سب کے فائدے کا خیال رکھا ۔ بیگم نے ہاتھ کھول کر لین دین شروع کیا ۔ ذرا سی کسی کی سالگرہ ہو جاتی اور وہ بنارسی جوڑے اور سونے کے زیور لے دوڑتیں۔

ویسے اب وہ عمر آ گئی تھی کہ واقعی اُن کے بھائی بہنوں جیسے تعلقات ہی رہ گئے تھے ۔ بیگم اُن کی احسان مند تھیں ۔ اُن کے سوا بیچاری کا تھا کون ؟ اگر وہ نہ ہوتے تو منجدھار سے ناؤ کون ترا کر لاتا ؟ چھوٹوں کو مانگتے تو وہ بے دریغ دیتیں ۔ مگر احمد بھائی کچھ کبیدہ خاطر سے رہتے تھے ۔ نیلوفر کا رویہ ویسا ہی معشوقانہ تھا ۔ وہ انہیں بے طرح جھکاتی ۔ وہ آتے تو بیٹھی بچوں کے ساتھ تاش یا کیرم کھیلا کرتی ۔ وہ کمرے میں بلاتے تو ٹالے جاتی ۔ بڑی مشکل سے بیگم بھیجتیں تو بات بے بات لڑنے لگتی ۔ ہاتھ چھوڑ بیٹھتی ۔ بلی کی طرح پنجے مارتی ۔ روٹھ کر اماں کے ساتھ جالیٹتی ۔ احمد بھائی منڈلاتے پھرتے ، خوشامدیں کرتے ،

رشوتیں دیتے تو وہ نہایت بے دلی سے بے گار ٹال دیتی۔ احمد بھائی ساری رات کبھی نہیں رہے۔ ان کے مسر کا حکم تھا: چاہے کہیں جاؤ، رات کو سوؤ گھر آ کر۔ بارہ بجتے ہی انہیں سنڈریلہ کی طرح بھاگنا پڑتا۔ کبھی اچھے موڈ میں ہوتی تو ساتھ بیٹھ کر شراب بھی پیتی، گالیاں بکتی اور پھر جوتم پیزار کرتی۔ ایک دم بھوت سوار ہو جاتا تو کتے کی طرح بھونکنے کا حکم دیتی اور بری طرح پیچھے پڑ جاتی۔ بیچارے کو بھونکنا پڑتا۔ پھر وہ خوب تالیاں بجاتی۔ اپنا جوتا پھینک کر حکم دیتی: چاروں ہاتھوں پیروں کے بل چل کر بھونکو، پھر منہ سے جوتا اٹھا کر لاؤ۔ پھر بھونکو اور جوتا پہناؤ۔ موڈ آ جاتا تو احمد بھائی خوب بھونکتے، دانتوں سے جوتا اٹھا کر لاتے، اور وہ پھر پھینک دیتی۔ بیٹھے بیٹھے ایک دم سب کے سامنے کہتی:

"گدھے کی بولی بولو۔"

"اس وقت نہیں، باد میں، باد میں۔"

"نہیں — ابھی بولو۔"

"کہہ دیا بابا اس وقت نہیں — پیچھو سب بولے گا۔ پہلا ادھر ایک پپی دیو۔"

"نہیں — ابھی، اسی وقت بولو۔ گدھے کی بولی بولو۔"

"کچھ دماغ خراب ہؤا ہے؟ بدتمیز کہیں کی۔"

بیگم ڈانٹتیں ۔

'' ہمارے بیچ میں کوئی مت بولو — ہاں ۔'' نیلوفر اڑ جاتی ۔ '' مما آپ چپ رہیے ۔''

''معلوم ہوتا ہے تیری شامت آئی ہے ۔'' بیگم غراتیں ، مگر احمد بھائی کہتے :

''عاسک ماسوک کا مخول ہے ، تم کائے کو بیچ میں آتا؟''

اور وہ گدھے کی بولی بولتے ۔ مگر اتنی دیر میں کہ نیلوفر کا موڈ خراب ہو جاتا اور وہ انہیں خون تھکواتی ۔ کبھی احمد احسان صاحب سے شکایت کرتے ۔ وہ اب تھک چکے تھے ۔ وہ عمر آ گئی تھی کہ وہ خود معشوق بنتے ، بیوی بچے اُن کی سیوا کرتے ، رعب مانتے ۔ مگر اُن کی تو دونوں طرف شامت تھی ۔ بیوی اُدھر گالیاں دیتیں ، بچے رتی برابر عزت نہ کرتے ، اوپر سے نیلوفر کے مظالم ! توبہ !!

احسان صاحب نے انہیں بہت سمجھایا کہ نیلوفر کی بات کا بھروسہ نہیں ، وہ ایک بد ذات لونڈیا ہے ، اُسے بہت سر نہ چڑھاؤ ۔ مگر احمد بھائی چاروں طرف سے جوتے لات کھاتے کھاتے بدحواس ہو چکے تھے ۔ ادھر چند مہینوں سے نیلوفر نے انہیں بہت ستایا تھا ۔ ایک دفعہ اُن کے پیٹ میں ایسی لات ماری کہ غریب کو ہرنیا کے اپریشن کے لیے پندرہ دن ہسپتال میں رہنا پڑا ۔ وہاں سے آئے تو بے طرح مذاق

اڑانے لگی ۔ ایسا بد حواس کیا کہ آن کے دل میں ڈر بیٹھ گیا ۔ پسینے چھوٹنے لگے ۔ سونے کا ورق چڑھی گولیوں سے بھی کچھ فائدہ نہ ہؤا ، آلٹا اختلاج ہونے لگتا ۔ اور آن کی ابتر حالت پر وہ قہقہے لگاتی ۔ گندے گندے تکلیف دہ مذاق کرتی ۔ ادھر جس فلم میں احمد بھائی نے پیسہ ڈالا وہ ڈبہ ہو گیا ۔ حالات بگڑتے ہی چلے گئے ۔

احسان صاحب اپنی دانست میں چٹان پر براجمان تھے ۔ گھر میں بیوی بچے شان و شوکت سے تھے ۔ ادھر بیگم سے دلچسپی ہنسی مذاق تک محدود ہوگئی تھی ، کیونکہ حال ہی میں انہوں نے ایک ایکسٹرا لڑکی سمن کو ایک دم سائیڈ ہیروئن بنا ڈالا تھا ۔ سبک نقشے والی سانولی سلونی سمن کو وہ ڈانڈا سے آٹھا لائے تھے ۔ سات پشت سے آس کے باپ دادا مچھلیاں پکڑتے آئے تھے ۔ خشک مچھلیاں بٹورتے بٹورتے وہ ایک دم ایکسٹرا بنی اور سال بھر کے اندر پروڈیوسروں کے چچوں کے سر پر چڑھ کر احسان بھائی تک آن پہنچی ۔ ان پر کچھ آس کی شوخی کا ایسا نشہ چڑھا کہ جھٹ رٹز ہوٹل میں کمرہ لے کر رکھ لیا ۔ ابھی اس کے سر کی جوئیں بھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ وہ سلیکس اور ٹی شرٹ پہنے ، دو فلمی چوٹیاں گوندھے گھومنے لگی ۔

پتی ورتا مسز احسان کے کان پر جوں تک نہ رینگی ۔

کہاؤ مرد کو سات خون معاف ھیں۔ اور حالانکہ فلم فلاپ ہو رہے تھے مگر احسان صاحب ہٹ تھے۔ جڑیں شریف تھیں ، سارا روپیہ ادھر آدھر سے سمیٹ کر آنہیں کے ھاتھ میں دے دیتے۔ اس لیے وہ کافی مطمئن تھیں۔ مرد ذات کہیں منہ کالا کرتا پھرے مگر گھر بار سے غافل نہ ہو تو پھر کیسی شکایت ؟ باندرہ میں زمین لی تھی، آس کا پٹہ بھی بیوی کے نام تھا کہ کبھی کو برا وقت پڑے قرق آئے تو گھر کا سارا سامان بیوی کے نام ہو، کوئی ھاتھ نہ لگا سکے۔ احسان دیوالیہ ہو کر پھر کسی اور کے نام سے نئی کمپنی چالو کر دیتے۔ پہلی کمپنی آن کے اپنے نام سے تھی، دوسری میں انہوں نے اپنے سالے کا نام ڈال دیا۔ آلو کا پٹھا سا تھا بیچارہ۔ جب کمپنی کا دیوالہ نکلا تو آس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ احسان صاحب نے اسے کھوکھرا پار کی طرف سے پاکستان بھگوا دیا۔ اب یہ تیسری کمپنی آن کے رشتہ کے بھانجے بھتیجے کے نام سے تھی۔ کرتا دھرتا وہ خود تھے۔

دنیا بھی کتنی عجیب ہے! جب ہفتہ بھر بعد ایک دن احسان صاحب مہابلیشور سے سمن کی آوٹ ڈور شوٹنگ سے لوٹے تو گھر ڈھنڈھار پڑا تھا۔ بیوی آن کے نہایت معتبر منہ بولے بھائی اور پرائیویٹ سیکریٹری کے ساتھ بھاگ گئی تھیں۔ دونوں لڑکیاں پڑوسیوں نے رحم کھا کر سنبھال لی

تھیں ۔ چھوٹا لڑکا آیا کے پاس چھوڑ گئی تھیں ۔ اُس سے تو یہ کہہ کر گئی تھیں کہ سینما جا رہی ہیں ۔ سامان گھر میں تھا ہی کتنا ؟ ایک ٹرک میں آ گیا ۔ آیا سمندر پر بچے کو گھما کر لوٹی تو گھر کے سامنے بیٹھی دونوں بچیاں دھاروں دھار رو رہی تھیں ۔ اندر دو چار ٹوٹے پھوٹے برتن اور تھوڑا سا بے کار سامان پڑا تھا ۔ بیگم نے احسان صاحب کے کپڑے تک مصلحتاً ساتھ لے لیے ۔ اُن کے دوست مظہر کے تو آ نہیں سکتے تھے ، کیونکہ وہ تو سانڈ کا سانڈ تھا اور احسان صاحب منحنی سے آدمی تھے ، مگر وہ انہیں زک دینے کے لیے سب کچھ لے گئی ۔ اناج کا دانہ تک نہ چھوڑا ۔

تعجب کی بات تھی کہ ایک سیدھی سادی گھریلو قسم کی عورت اپنی عمر سے چھوٹے جوان کے ساتھ کیسے سب کچھ چھوڑ کر بھاگ گئی ؟ مگر مظہر اتنا کم عمر نہ تھا جتنا زمانے نے اُسے بنا رکھا تھا ۔ اس کی کامیابی کا ایک گُر یہ بھی تھا کہ وہ ہر شخص کو بڑے بھائی اور صاحب کے لقب سے یاد کیا کرتا تھا ۔ سولہ برس کی عمر میں گھر سے بھاگ آیا ۔ بگڑے نواب کا بیٹا تھا ، ماں بہنوں کے زیور ہی سے بمبئی میں کئی سال گزارا ہو گیا ۔ اگر خود اُس کی جان کو چچے نہ لگ گئے ہوتے تو شاید اور کچھ دن عیش کر لیتا ۔ لیکن اس ذرا سی عمر میں یار لوگوں نے اُسے وہ

چک پھیریاں دیں کہ دیوالہ نکل گیا ۔ کئی سال تو عشق عاشقی سے فرصت نہ ملی ۔ نہ جانے کتنی لتیں لگیں اور چھوٹیں ۔ جب ہوش آیا تو خود کو ایک بوڑھی ہیروئن کی ناز برداریاں اٹھاتے پایا ۔

اور پھر مظہر نے زندگی سے سمجھوتا کر لیا ۔ جب اس بوڑھی ہیروئن نے اُس سے بھی کمسن چھوکرے کو گھر بار کا مالک بنا لیا تو وہ نہ جانے کہاں سے لڑھکتا پڑھکتا ایک طرحدار پروڈیوسر کا چمچہ بن گیا ۔ وہ ، جو کبھی دوسرے چمچوں کے لیے پتیلے کا کام دیتا تھا! جب پتیلا چمچہ بن جائے تو پھر کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہ جاتی ۔ اُسے چمچہ بازی کے تمام گر آتے تھے ۔ وہ مختلف پروڈکشنز میں رہا ۔ جس کے ساتھ کام کرتا بس اُسی کا ہو رہتا ۔ آہستہ آہستہ اُسی کے گھر میں سونے لگتا ، کیونکہ دو دو تین تین بجے رات تک پارٹیوں کا انتظام کرنے کے بعد بالکل نڈھال ہو جاتا ۔ وہ کون سا کام تھا جو وہ نہیں کر سکتا تھا ؟ وقت بے وقت اگر پروڈیوسر چڑیا کا دودھ یا بیل کا انڈا مانگتا تو وہ ٹیکسی لے کر بمبئی کا کونا کونا چھان مارتا اور بیل کے انڈے سے بھی زیادہ عجیب شئے لے کر لوٹتا ۔ جس کے گھر میں رہتا ، رشتہ دار بن کر رہتا ۔ اُس کی بیوی سے فوراً ماں بہن یا بھابی کا رشتہ لگا لیتا ۔ اُس کی ماں کو اماں کہتا ۔ اُس

کی ساس سے بالکل دامادوں کی طرح ملتا ۔ اُس کی بہنوں کو کنوار پتے کا غم غلط کرنے میں مدد دیتا ۔ اس کے بچوں کو باپ کی مصروفیت کی وجہ سے شفقتِ پدری دیتا اور شوہر کی جدائی میں آنسو بہانے والی بیوی کے سرد ہاتھ گرماتا اور اُس کے آنسو اپنے دامن میں جذب کر لیتا ۔ ایک طرف وہ اپنے مالک کو داشتہ سپلائی کرتا ، دوسری طرف اُس کی بیوی کے سینے میں بھڑکتی ہوئی سوتیاہ ڈاہ کی جلن پر مرہم رکھتا ۔ اگر بیوی کو آپا کہتا تو داشتہ کو فوراً بھابی بنا لیتا ۔ اس لیے اُس سے سب خوش تھے ۔ دنیا کا کوئی کام ہو وہ فوراً کر دیتا ۔ چاہے حاجی کے ہوٹل سے نان کباب لانے ہوں یا نیوی میس سے وھسکی ؛ پون ہل سے گانے والی کا انتظام کرنا ہو یا مچھلی کے شکار کی تیاری ؛ خام فلم چاہیے ہو یا اسٹاک شاٹس — مظہر بے تکان مہیا کر دیتا ۔

جس پروڈیوسر کے ساتھ چپک جاتا اُسے خدا سمجھنے لگتا ۔ ساری انڈسٹری میں اُسی کے گیت گاتا پھرتا ۔ اُس کی ایسی پبلسٹی کرتا کہ پیسے خرچنے کی پھر کوئی ضرورت نہ ہوتی ۔ بس جہاں جاتا اُس کی ذہانت ، عقلمندی اور طراری کے افسانے سناتا :

” واہ صاحب واہ ! کمال کر دیا صاحب نے تو ۔ یعنی

کیا شوٹ لیا ہے کہ سالہ کیمرہ مین کی ریڑھ کی ہڈی ٹیڑھی ہوگئی - کیا پکچر بن رہی ہے - قسم سے پولیس کے آتارے نہیں آترے گی - کیا ہیں یہ آپ کے شانتا رام اور محبوب !''

اس کے عیبوں تک کی شیخی مارتا :

''صاحب آج تین مہینے سے سیٹ کھڑا ہے - بس دن میں مشکل سے ایک آدھ شوٹ ہو جاتا ہے - یعنی ایک سونگ پر چالیس ہزار فٹ فلم کوڑا ہوگیا - صاحب اصلی سنگِ مرمر منگوا رہے ہیں - صرف دو شوٹ ہیں اس سیٹ کے - اور کمال یہ ہے کہ فرش دکھائی بھی نہیں دے گا - کلوزشاٹ ہیں - مگر ہمارے صاحب کو بس ضد ہے - یعنی کہ جو وہ چاہتے ہیں وہ ہونا ہی چاہیے ، نہیں تو موڈ نہیں آتا -''

یہی وجہ تھی کہ جب ایک پروڈیوسر کا دیوالہ نکل جاتا تو وہ آسے ورثہ کے طور پر دوسرے پروڈیوسر کے سر چپکا جاتا -

یہی وجہ تھی کہ احسان صاحب کو مظہر پر اتنا اعتبار تھا کہ خود اپنی ذات پر نہیں تھا - آن کی عقل کام نہیں کرتی تھی کہ اتنی پارسا بیوی اور سچا دوست کیسے دغا دے گئے ؟ کئی دن تو بالکل سناٹے میں پڑے رہے - ادھر سمن نے جب ان کی یہ حالت دیکھی تو وہ سوتیا ڈاہ سے

جل مری اور ایک دم روٹھ گئی ۔ رٹز ہوٹل کے بل کا ماتم کرتی ، گالیاں دیتی ، مول چند بزاز کے کھار والے فلیٹ میں ، جو عرصہ دو ماہ سے خالی پڑا تھا ، آٹھ آئی ۔ مول چند نے حال ھی میں اونر شپ کے فلیٹ بنوا کر بڑا مال کمایا تھا ۔ فلم اسٹاروں کا بڑا دیوانہ تھا ۔ اس کے حسابوں سمن فلم اسٹار تھی ! اسی زمانے میں احسان صاحب کو پیرا ٹائیفائیڈ نے دبوچ لیا ۔ فلم کا حساب تو گڈ مڈ چلتا ھی ھے ، بلیک کی جھوٹی رسیدیں بھی ابھی پوری نہیں بنی تھیں ، قرض دار ٹینٹوے پر سوار تھے ، اس لیے وہ اپنی پہلی بیوی کے پاس لکھیم پور انڈر گراؤنڈ ھو گئے ۔

جی ھاں یہ فلم لائن ھے ۔ یہاں ھر پہلی بیوی سے ایک اور پہلی بیوی ھوتی ھے ۔ یہ ایسی ھی لائن ھے ۔ یہاں عشق ، شادی اور بیوپار ، سب گودڑ کی پوٹلی کی طرح ھے ۔ فلمی آدمی کو بارھا شادیاں رچانا پڑتی ھیں ۔ ایک تو وہ شادی ھوتی ھے جو والدین نو عمری میں کر دیتے ھیں ۔ جب بیوی بچے ایک مستقل طعنہ بن جاتے ھیں اور گھر میں گھسنا محال ھو جاتا ھے تو وہ بھاگ کر فلم لائن میں پناہ لیتا ھے ۔ اور اگر گھر جنوائی ھو تو ساس سسر ھر نوالے پر سو جوتیاں رکھ کر دینے لگتے ھیں ۔ جب ساری نوکریاں ملنے کی عمر گزر جاتی ھے تو ملنے جلنے والے آسے قرض کی وبا سمجھنے

لگتے ہیں ۔

تب اُسے وہ فلمی معجزے یاد آتے ہیں : محبوب ایک ایکسٹرا تھے، آج فلم انڈسٹری کے مائی باپ ہیں ۔ شانتا رام اسٹیج پر ناچا کرتے تھے ۔ اشوک کمار پچاس روپیہ مہینہ کے اسسٹنٹ تھے ۔ سب کے سب کامیاب اور بڑے بڑے لوگ کچھ نہیں سے سب کچھ بن گئے ۔ اور وہ اپنی بیوی کا بچا کھچا زیور لے کر ، یار دوستوں سے سوٹ مانگ کر ، سوٹ کیس اور ہولڈال ادھار حاصل کر کے بمبئی روانہ ہو جاتا ہے ۔

بمبئی پہنچ کر وہ کچھ دن ہوٹلوں میں رہتا ہے ۔ پھر جب حالت گرنے لگتی ہے تو وہ سامان کسی کے گھر میں ڈال کر کھانا مفت خوروں کے ساتھ کھانے لگتا ہے ۔ کپڑے کسی کے کھاتے میں دھلواتا ہے ، ناشتہ کسی کے ہاں کر لیتا ہے اور سونے کو جہاں بھی رات کو دیر ہو جائے پڑ رہتا ہے ۔ صبح ہی صبح کسی اسٹوڈیو میں پہنچ جاتا ہے ۔ وہاں ہیروئن یا سائیڈ ہیروئن کے ساتھ لگا رہتا ہے ۔ کبھی ہیرو یا ولین کے ساتھ چپک جاتا ہے ۔ یہ لوگ بھی بوریت سے بچنے کے لیے اُسے جھیل جاتے ہیں ۔ فلم آرٹسٹوں کا نہ کوئی کلب ہے ، نہ کوئی تفریح کی جگہ ، نہ کسی چیز میں دلچسپی لینے کا وقت ۔ اس قسم کے لوگوں سے ، جو ذرا مسکا لگانا جانتے ہوں ، اُن کا وقت کٹ جاتا ہے ۔ ہر

ہیرو شوٹنگ کے بعد گھر پر ایسے ہی پر کٹے کبوتروں کو گھیرے دوسرے فنکاروں کی برائیاں بکھانا کرتا ہے۔ شراب کا شغل چلتا ہے۔ امیدوار کو بھی کچھ حلق تر کرنے کے لیے مل جاتی ہے۔ اسی طرح وہ آہستہ آہستہ اس کا چمچہ بن جاتا ہے۔

اس عرصے میں وہ واپس لوٹنے کا وعدہ کر کے بیوی سے اور زیور بکوا کر پیسہ منگا لیتا ہے۔ جب اس کے جوتے پھٹ جاتے ہیں، کپڑے تار تار ہونے لگتے ہیں تو وہ کچھ دن کے لیے گھر لوٹ بھی جاتا ہے۔ مگر اس عرصے میں اسے بمبئی کی ہوا لگ چکی ہوتی ہے اور فلم لائن کا چسکہ پڑ جاتا ہے۔ گھر والوں پر وہ خوب اپنی دوستیوں کا رعب ڈالتا ہے۔

ہزاروں اور لاکھوں کی باتیں کرتا ہے اور پھر ادھر اُدھر سے پیسے بٹور کر بمبئی آجاتا ہے۔ اگر وہ اچھا مسکہ باز ہے تو بہت جلد کسی ہیروئن یا ہیرو کے کواپریشن سے پروڈیوسر یا ڈائرکٹر بن جاتا ہے۔ چوکنے سود پر ادھار اسٹوڈیو اور خام فلم کا انتظام کر کے وہ ہیرو سے بغیر معاوضہ لیے دس دن کی شوٹنگ کی بھیک مانگ لیتا ہے۔ یا تو خود ہی ڈائرکٹر پروڈیوسر بن جاتا ہے یا اپنے کسی کنگال دوست سے فلم ٹھکوا لیتا ہے۔ بظاہر وہ اور ڈائرکٹر خود

کچھ نہیں لیتے، مگر جب فلم کی بزنس ہو جاتی ہے تب اُس کے ختم ہونے تک ٹھاٹ ہو جاتے ہیں۔ وہ فوراً نئی پتلونیں اور نائیلون کی بش شرٹیں بنواتا ہے۔ ایک فلیٹ لے کر اس میں ہی آفس کھول دیتا ہے۔ جرنلسٹوں کو کھلا پلا کر خوب پبلسٹی کرواتا ہے۔ ایک دم اُس کی بڑی پوزیشن ہو جاتی ہے۔ ہیرو بننے کے خواہش مند نوجوان اور دوشیزائیں مع اپنی ماں یا نانی کے اس کے گرد جمع رہتے ہیں۔ صبح سے شام تک ہزاروں مفت کام کرنے والوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ کوئی مفت کہانی لیے چلا آتا ہے، کوئی مفت میوزک دینے پر تلا ہؤا ہے:

"آپ فلاں شاعر کو ایک گانے کے ہزار روپے دیتے ہیں، میں مفت لکھنے کو تیار ہوں۔ ہٹ ہو جائے تو دے دیجیے گا۔"

"بس میں تو سکرین پر نام دیکھنا چاہتا ہوں۔ کہانی لے لیجیے، چاہے کچھ نہ دیجیے۔"

مگر یہاں بھی کام سے پہلے نام بیچنا پڑتا ہے۔ اس لیے ہوشیار پروڈیوسر نام کسی کا بیچتا ہے، کام کسی اور سے اونے پونے لے کر ٹھوک دیتا ہے۔ اب کون اس سے سر مارتا پھرے۔

اور اسی زمانے میں آسے کسی ایکسٹرا یا ناکام سائیڈ

ہیروئن سے عشق ہو جاتا ہے ۔ وہ اسے اگلی پکچر میں ہیروئن کا چانس دینے کا جھانسہ دے کر اپنا الّو سیدھا کر لیتا ہے ۔ اگر وہ صابر اور سیدھی سادی ہے تو وہ اسے کچھ دن اور جھیل لیتا ہے ۔ پھر کسی اور کو ہیروئن بنانے لگتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ جسے وہ غلطی سے ہیروئن بنا دے وہ فوراً نیک اور پارسا بن کر اپنی اماں ابا کے زیر سایہ لاکھوں کمانے لگتی ہے ۔ اگر اس کی فلم ہِٹ ہوئی ہو تو وہ اس سے قطعی ناطہ توڑ لیتی ہے ۔

اس لیے وہ ذرا بھی جاندار لڑکی دیکھتا ہے اور وہ اسے پسند آ جائے تو اسے گھیر گھار کر شادی کر لیتا ہے ۔ وہ بھی پروڈیوسر کی بیوی بننے میں زیادہ شان محسوس کرتی ہے ۔ کل تک سیٹ پر دھتکاری جاتی تھی ، آج بیگم صاحب کہلاتی ہے ۔ بات بے بات ہر ایک پر رعب جماتی ہے ۔ پیٹھ پیچھے لوگ اسے بھیانک گالیاں دیتے ہیں ، منہ پر سلام جھاڑتے ہیں ۔

احسان صاحب کی بیگم بھی کسی زمانے میں رنجیت میں مستقل سائیڈ ہیروئن تھیں ۔ عموماً کامیڈین کے ساتھ ڈھول دھپوں کے سین میں رول کیا کرتی تھیں ۔ مگر اب لوگ انہیں بھول بھال چکے تھے ۔ وہ بھی بال بچوں میں گھری ہوئی بالکل میلی کچیلی گھرستن بن گئی تھیں ۔ مگر احسان صاحب

کی آئے دن کی عشق بازیوں سے آکتا کر کبھی کبھی وہ بھی کسی میں دل چسپی لے لیا کرتی تھیں۔ مظہر سے کئی سال سے میل جول بڑھ رہا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ وہ بیوی پر پورا پورا بھروسہ کرتے ہیں۔ سب حساب کتاب اُسی کے ہاتھ میں تھا۔ اب جو سمن کا قصہ چلا تھا، اس سے بیگم خار کھائے بیٹھی تھیں، پہلی فرصت میں کوڑا کرکٹ احسان میاں کے سر پٹخ وہ جھاڑو دے کر چلتی بنیں۔

اور احسان میاں کچھ نہ کر سکے۔ کیونکہ سارا روپیہ چوری کا تھا اور بیگم اُن کی فلمی بیوی تھیں۔ نکاح کرنے کی کبھی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوئی۔ اس روزِ بد کی کسے اُمید تھی؟

اُن کے جانے کی بیگم کو بڑی خوشی ہوئی۔ پاپ کٹا۔ کمبخت بہت اتراتی تھی، جیسے نیلوفر تو بیسوا ہے اور وہ مالزادی بڑی بھلی بیوی ہے۔ کیا ناک چڑھا کر بات کرتی تھی۔ دوسرے احسان میاں کا کمیشن جاری تھا۔ اور اب انہیں چونکہ اُن کی مدد کی ضرورت نہ تھی، اس لیے کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے۔ اب وہ احمد بھائی سے براہِ راست چپ چاپ سودا کر لینا چاہتی تھیں۔ کئی بار انہوں نے بے رخی برتی، مگر احسان صاحب ایک ڈھیٹ تھے۔ کھیسیں کاڑھے ہنسا کرتے اور پیسہ لیے بنا نہ ٹلتے۔ کتنی ہوس تھی۔ کمبخت

کا کسی صورت تنور بھرتا ہی نہ تھا ۔ ادھر اُدھر الگ ہاتھ مارتا تھا ۔ انہوں نے ان کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر کان بھرنا شروع کیے ۔ اُٹھتے بیٹھتے رونا روتیں ۔ ہر بات کا حساب کرتیں ۔ ساری بے ایمانیوں کے پول کھول دیے ۔

کس قدر بدل گئی تھیں ان چند سالوں میں وہ ! ان کی باتوں میں بازاری رنگ جھلکنے لگا تھا ۔ اگر کوئی عورت احمد بھائی کی طرف نظر بھر کے بھی دیکھ لیتی تو وہ سوتیاہ ڈاہ سے جل کر مرنڈا ہو جاتیں ۔ وہ کھُلی کھُلی گالیاں سناتیں کہ توبہ ۔ نیلوفر کو ویسے ہی احمد بھائی سے خدا واسطے کا بیر تھا ، ان باتوں کا بہانہ لے کر وہ بالکل ہی ان کا کچومر نکال دیتی ۔ بات بات پر منہ بھر کے گدھا ، پاجی ، حرامی پلا کہہ دیتی ۔ اب تو وہ جوتی بھی اٹھا کر مارنے سے نہ چوکتی ۔

''اے ہے بدبخت رزق کو جوتا مارتی ہے ۔'' بیگم سہم کر کہتیں ۔ ان کی دانست میں احمد بھائی آٹے کی اس بوری کی طرح تھے جس کا منہ مستقل کھلا رہتا تھا ۔ ماہانہ تنخواہ کے علاوہ روز ہی وہ کچھ نہ کچھ لے آتے ۔ نیلوفر نظر اٹھا کر نہ دیکھتی ۔ بیچارے اداس ہو جاتے :

''کیا بیبی کبھی بھی خوش نہیں ہوتا ؟'' وہ اسے فلمی بیبیوں کی طرح بیبی کہتے تھے ۔ کچھ بھاؤ اونچا لگنے

لگتا تھا ۔

'' ارے بنتی ہے احمد بھائی ۔ منہ پر نہیں ظاہر کرتی ، آپ کے چھیڑ میں اسے مزہ آتا ہے ۔''

وہ منجھی ہوئی نائیکہ کی طرح کہتیں۔ پیشے کے ساتھ ساتھ گر قدرت نے ضرورت کے لحاظ سے خود بخود سکھا دیے ۔ بیگم پر خوب بوٹی چڑھ رہی تھی ۔ رنگ نکھر کر گلاب کی پتی ہو گیا تھا ۔ میک اپ بھی ڈٹ کر کرنے لگی تھیں۔ پہلے تو بالوں میں کبھی کبھی مہندی لگا لیا کرتی تھیں ، مگر جس دن سے بیبی کے بال پرمانٹ سیٹ کرانے ہیئرڈریسر کے ہاں گئیں ، اس نے رائے دی تو خضاب لگوانے لگیں۔ بال کافی چھدرے ہوگئے تھے، مگر پہلے سے بہت جوان لگتی تھیں۔ بڑے ٹھسے کے بلاؤز سلواتیں : نہایت لوکیلے ، چولی کٹ کے بری طرح پھنسے ہوئے ۔ گوشت کے بوٹے ابل پڑتے۔ سوجے ہوئے سڈول ہاتھ انگوٹھی چھلوں سے لدے رہتے ۔ جب وہ چاندی کی پٹاری سامنے رکھے گلوریاں بناتیں تو بس سارنگی کی گنگناہٹ اور طبلے کی تھاپ کی کسر رہ جاتی تھی ۔

سلیم کو انہوں نے پنچگنی سینٹ پیٹر میں داخل کروا دیا تھا ۔ لڑکیوں کو بھی اس سال وہیں کمبنز میں چھوڑ آئیں ۔ گھر کی فضا کمسن بچوں کے لیے سازگار نہ تھی ۔ نیلوفر اور احمد بھائی کا عشق بالکل بلوں جیسا چیختا ، چنگھاڑتا ہوا

کرتا تھا۔ بچوں کے دلوں میں کھد بد ہؤا کرتی۔ دروازے بھوڑ دیتی تھی۔ نشے میں چور ایک دن احمد بھائی نے کیا حرکت کی کہ برآمدے میں بیٹھی ہوئی حلیمہ کی گھگی بندھ گئی۔ روتی ہوئی آکر وہ ماں سے چمٹ گئی۔ احمد بھائی کچھ یونہی سا تولیہ لپیٹے اپنی صفائی پیش کرنے چڑھے چلے آئے۔ ھاتھ چلا چلا کر کہنے لگے:

"ایک دم بدماس چھوکری ہے۔ پرائیویٹ روم میں کائے کو جھانکا؟ ہم کچھ نہیں کیا۔ اتنا بولا: 'بابا ادھر ہم بات کرتا ہے، اکلسی میں جا کے کھیل۔' اوپر سے بولتی ہم اس کا چھاتی نوچا۔ کیا بابا — ہم کائے کو نوچتا؟ کیا ہم ایسا موالی ہے؟ بولو!"

بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر ٹالا۔ اور نیلوفر کو دیکھو! بے حیا کھی کھی ھنستی رہی، جیسے کچھ بات ہی نہ ہو۔ بڑی اب کافی ھوشیار ہوگئی تھی۔ وہ خوب سمجھتی تھی کہ احمد بھائی کا نیلوفر سے کیا رشتہ ہے؟ احسان صاحب بھی اُس پر ضرورت سے زیادہ مہربان نظر آتے تھے، بات بے بات گود میں گھسیٹ کر دبوچتے:

"ارے کیا اسکول میں وقت ضائع کرتی ہے۔ اسے ناچ سکھواؤ۔ لچھو مہاراج سے میرے بڑے اچھے مراسم ہیں۔" وہ رائے دیتے، اور بیگم کا خون کھول اٹھتا۔ ایک بھینٹ

تو آنہوں نے چڑھا دی ، مگر خاندانی بننے کا پروگرام آنہیں بڑا گھناؤنا معلوم ہوتا ۔ نیلوفر ویسے بڑی لا آبالی تھی ، مگر بھائی یا بہن پڑھنے میں کوتاھی کرتے تو چار چوٹ کی مار دیتی ۔ کبھی آن کی کتابیں ھاتھ آجاتیں تو بڑے پیار سے آنہیں آلٹ پلٹ کر دیکھتی ، جیسے آن کے ورقوں میں اپنا وہ کھویا ہؤا زمانہ ڈھونڈ رھی ھو جب وہ اسکول جاتی تھی ۔ آف ، کیا دن تھے وہ بھی! کیا سر جوڑ کر گوئیوں سے باتیں ہؤا کرتی تھیں ! زندگی کی باتیں ، پیار اور چھیڑ چھاڑ کی باتیں ؛ کنوارے خوابوں کی دھڑکتی ہوئی باتیں ، جن میں آبٹن کی خوشبو تھی ، مہندی کا رچاؤ تھا — اور سہاگ پُڑے کی مہک تھی ۔ اور پھر وہ آن چپ چاپ گونگی شہنائیوں کے سروں میں کھو جاتی ، جو اب کبھی نہیں بجیں گی ۔ پھر وہ چونک پڑتی ۔ احمد بھائی کے رال میں لسڑے ہوئے ہونٹ اس کی کمزور کنواری ھستی کو بھنبوڑ ڈالتے اور وہ بڑی بے دردی سے جو چیز ھاتھ آ جاتی کھینچ مارتی ۔ وہ بڑی مرکھنی ھو گئی تھی ۔ ایک دن مذاق ھی مذاق میں احمد بھائی کے ایسی بے جگہ لات مار دی کہ ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح اڑانے لگے ۔ بڑی مشکلوں سے سیڑھیاں آترے ۔ دوسرے دن چڑھتے وقت ایسی ٹیسیں آٹھیں کہ پسینے میں ڈوب گئے اور وھیں سیڑھیوں پر ڈھیر ھو گئے ۔ سیدھے ھسپتال

گئے۔ معلوم ہؤا ہرنیا کا اسٹرنیگولیشن ہو گیا ۔ اگر ذرا اور لاپرواہی برتی جاتی تو اللہ کو پیارے ہوگئے ہوتے ۔

واچہ نرسنگ ہوم میں دو ہفتہ پڑے رہے ۔ روز نیلوفر کی دھائی ڈالتے، مگر سو سو نخروں کے بعد جاتی اور لڑنے لگتی۔ اُدھر آن کے سسر نے ڈوریاں کھینچنا شروع کیں ۔ فلم میں لگایا ہؤا روپیہ ڈوب چکا تھا ۔ ہسپتال کا بل ادا کرنا مشکل ہوگیا۔ بیگم سانپ بنی جو مٹھی میں تھا دبائے بیٹھی تھیں ۔ تھا بھی کیا ؟ خرچ سے خرچ تھے ۔ پانچ سو تو بچوں کا ہی نکل جاتا تھا ۔ پھر آے دن پارسلیں جاتیں ۔ بیگم خود دوڑ دوڑ کر جاتیں ۔ گھر میں بھی لنگر خانہ کھلا ہؤا تھا ۔

احسان صاحب سسرال سے لوٹ آئے تھے ۔ احمد بھائی سے اب آن کی کٹّی ہو گئی تھی ۔ بقول کسے اب احمد بھائی بھی کڑکے ہو چکے تھے ۔ آدھی بنی فلم کے ورلڈ رائٹ جس کے پاس تھے اُس نے آفس پر قبضہ کر لیا ۔ ہر طرف احمد بھائی ہنڈیاں دے چکے تھے ۔ اُدھر ڈسٹری بیوٹر فلم کی ڈلوری کا تقاضہ کر رہے تھے ۔ مگن لال ڈریس والے نے الگ دعویٰ ٹھوک دیا ۔ فرنیچر والے نے نوٹس دے دیا ۔ پے در پے تین فلاپ فلم بنائے ۔ بال بال قرضے میں بندھ گیا ۔

کتنا سمجھایا حرام زادی نیلوفر کو کہ زیور لے ، یہ کوڑے کرکٹ میں پیسے مت غارت کر ، مگر آسے تو جیسے

ضد تھی - کالی پیلی گندے رنگوں کی ساڑھیوں کے علاوہ کبھی جو کسی چیز میں دلچسپی لے جائے - اور ساڑھیاں بھی وہ پہنتی کب تھی ؟ بس ایک میلا سا ھاؤس کوٹ پہنے گھوما کرتی تھی - لاکھ سمجھایا مگر کبھی بن ٹھن کر تیار نہ ہوئی - نتیجہ یہ کہ جب فلیٹ پر بھی ٹانچ آ گئی تو حواس گم ہو گئے -

اس برے وقت میں حیرت ہے کہ کام آئے احسان صاحب! جیسے ہی سنا ، فوراً سورج مل کو لے کر بھاگے آئے - اسی وقت فلیٹ خرید کر کاغذ انہوں نے بیگم کے قدموں میں ڈال دیے اور سب کو آن کی موٹر میں بھر کر " گے لارڈ " میں کھانا کھلانے لے گئے -

احمد بھائی نے بڑا ماتم برپا کیا - سورج مل مسکرا کر اٹھے اور چل دیے - بیگم روکتی رہ گئیں -

" آپ ان سے نبٹ لیجیے ، میں شام کو آؤں گا -"

احمد بھائی نے بڑے فیل مچائے - سورج مل کو گولی مارنے کی دھمکی دی -

" اے ہے دیوانہ ہو گیا ہے؟ کمبخت وہ تو دو گھڑی کو آیا اور چلا گیا - خدا قسم کیا شریف آدمی ہے - بیبی کی طرف بری نگاہ تک نہ ڈالی ، ہاتھ پکڑنا تو بڑی بات ہے -"

" ہن سالہ تم کتنا بے ایمان ہے - ہم جرا بیار پڑا اور

تم اُدھر دوسرا سیٹھ چالو کر دبا - پکا چور ہے تم لوگ -''

'' اے توکیا سڑک پر جاپڑتے ؟ اس بیچارے نے برے وقت .یں سہارا دیا ، ورنہ تم تو وھیں اپنی جورو کے کابکے میں گھسے بیٹھے رھتے - ھم یہاں ویران ھو جاتے تو تمھاری بلا سے -''

'' کیا بکواس کرتا تم - ھم سالہ جورو کا پاس کب گھسا ؟ ھم اپنا سامان لینے کو گیا - ھم اس کو طلاق دے دے تم بولے تو - بس آج ھی نکاح ھو جاوے - سالہ کھٹ کھٹ کھتم ھووے -''

'' نکاح ؟ '' بیگم نے قہقہہ لگایا - '' سیٹھ جب وقت تھا اور ھم نے تمھاری جوتی پر نکاح کے واسطے ناک رگڑی تھی تو کیا ٹکا سا جواب دے دیا تھا : ' نکاح کا لفڑا نہیں مانگتا -' ھنہ ! ھے ھے بچی کو بچا لیا اللہ نے ، ورنہ میں کمبخت تو خود ھی چولھے میں جھونکنے کو تیار تھی -''

'' پر اب ھم بولتا نا - نکاح بھی کرے گا - ھاں اور کیا ؟ ''

'' تو نیلوفر سے پوچھ لو- وہ راضی ھو تو میری بلا سے -'' بیگم جانتی تھیں نیلوفر کیا جواب دے گی - چڑھانے کو بن کر بولیں -

'' نا بابا ! اُس کا مستک پھریلا ھے - ھم تم کو بولتا -''

'' ہم کو کیا بولتا ؟ '' منہ چڑھا کر بولیں۔

'' تم آس کا گارجین ہے۔''

'' آوئی میں کیوں ہوتی گارجین ہمارجین ؟ اللہ رکھے ننھی نہیں اب وہ ۔ اپنی مرضی کی مختار ہے ۔ اس کا جو جی چاہے کرے ۔ ایک چھوڑ دس نکاح کرے ، میری جوتی سے ۔''

'' وہ ایک دم سالہ ھلکٹ ہے ۔''

'' میں کچھ نہیں جانتی ۔ کمرے میں بیٹھی ہے ، بات کر لو جا کے ۔''

ڈرتے ڈرتے احمد بھائی کمرے میں گئے ۔ نیلوفر منٹا رنگ کی اطلس کا ھاؤس کوٹ پہنے فرش پر پڑی تھی ۔ اس کی ایک ران کھلی تھی ۔ آج احمد بھائی نے دروازہ بند کر لیا ۔

''بیبی !'' وہ ڈرتے ڈرتے بولے ۔ سفید ھاتھی دانت جیسی پنڈلی پر سنہری رونگٹے جگمگا رہے تھے ، جیسے کسی مشاق سنار نے کندن جڑ دیا ہو ۔

'' بیبی ڈارلنگ ۔'' احمد بھائی گھگھیائے ۔

'' کیا ہے ؟'' آس نے میگزین کے پیچھے سے جواب دیا۔

'' کیسا ہے تم ؟ ''

'' اچھا ہے ہم ۔ کائیکو ؟'' نیلوفر احمد بھائی کی صحبت میں بڑے لٹکے سے ویسے ھی بولنے لگی تھی ۔

'' تم ناراج ہے کیا ہم سے ؟''

'' کائیکو ؟ '' اُس نے ان کی نقل اُتاری ۔

'' پھر تم ہمارے کو کِس نہیں دیا ۔''

'' کِس مانگتا ؟ لیو کِس ۔'' اُس نے اپنے گول گول ہونٹ پھلا کر ٹھوڑی آگے بڑھا دی ۔ مگر جب احمد بھائی اس پر جھکے تو وہ لوٹ لگاتی دور چلی گئی ۔ جھوک میں اوندھے ہو گئے بیچارے ۔ ڈاکٹر نے احتیاط کا حکم دیا تھا ۔

جب وہ ہلکان ، پسینے میں تر ، لرزتی ٹانگوں سے سر جھکائے نیچے اُتر رہے تھے تو نیلوفر کے قہقہے اُن کے پیچھے تالیاں بجاتے دوڑنے لگے ۔

'' اے کیا ہؤا ؟ کیوں چلے گئے اتنی جلدی ؟ ''

'' فیوز اُڑ گیا ۔'' نیلوفر نے قہقہہ لگایا ۔ بیگم کی خاک سمجھ میں نہ آیا ۔ نیلوفر پاگلوں کی طرح اُونچے اُونچے قہقہے لگا رہی تھی ۔ مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ رہے تھے ۔ آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا ۔

'' دیوانی ہو گئی ہے کمبخت ! '' انہوں نے بچوں کو باہر ڈھکیل کر اُس کے جسم پر چادر ڈال دی ۔ مگر جب نیلوفر نے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو کر تفصیل بتائی تو بیگم بھی مسکراہٹ نہ روک سکیں ۔

'' اے ہے — بڑی ظالم ہے تو ۔'' وہ بولیں ۔

'' واہ، ہم کیا کرتے ؟'' نیلوفر اٹھلائی اور لاتوں سے چادر دور پھینک دی - '' اُف کیا گرمی ہے -''

نیلوفر کو بیگم نے جنم دیا تھا - ابھی چند سال پہلے تک کبھی کبھی اپنے ہاتھوں سے نہلا بھی دیا کرتی تھیں - مگر اس وقت اُس کی ننگی جوانی کو ملگجے بستر پر مچلتا دیکھ کر تھرا اٹھیں، جیسے خود انہیں لے جا کر کسی نے چوراہے پر ننگا کر دیا ہے - قسمت نے دھکے ضرور دیے تھے، مگر ان میں اب بھی شرم و حیا موجود تھی - احسان صاحب تو خیر غیر تھے، انہوں نے نواب صاحب کے سامنے جوانی کے دنوں میں بھی کمرے میں بجلی روشن نہ کرنے دی - اور نیلوفر کا دھندا تو تھا ہی تاریکی کا - سو کینڈل پاور بلب کے نیچے اس کا دھکتا ہؤا پنڈا انہیں جلا کر راکھ بنا رہا تھا -

'' اٹھ بے حیا - کیسا سانڈنی کی طرح پڑی اینڈ رہی ہے -''

'' اوں، ہمیں گرمی جو لگتی ہے -'' وہ اور پسر گئی - دروازہ بند کر کے وہ لوٹ آئیں، اور سلیم کے ایک دھول جڑی، جو کھڑکی میں سے جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا - وہ پندرہ دن کی چھٹیوں میں پنچگنی سے آیا ہؤا تھا اور واپس جانے کے خیال سے اداس ہو رہا تھا -

تیسرا باب

احسان صاحب لوٹ کر آئے تو معلوم ہوتا تھا نہ جانے کتنے برس کھٹیا گوڑ کر آئے ہیں ۔ بے حد لاغر ۔ ایک دم خصاب چھوڑ بیٹھنے سے عجیب چتکبرے ، جنگلی بلاؤ کے سے روکھے بال ؛ مٹی جیسی مردہ رنگت ؛ بوسیدہ لباس ۔ ان کی عورت اور سیکریٹری نے بالکل ننگا کر کے چھوڑا تھا ۔ اصلی بیوی کے پاس اگر کچھ تھا بھی تو وہ چھدام خرچ کرنے پر تیار نہ تھی ۔ وہاں سے خالی دل ، خالی ہاتھ لوٹے ۔ بیگم کے پاس دو وقت کے کھانے کا سہارا تھا ، مگر وہ بھی بار بار جتاتی رہتی تھیں کہ انہوں نے اپنا کمیشن پا لیا ۔ ادھر جب سے احمد بھائی کے لات لگی تھی وہ ذرا خسیس ہو گئے تھے ۔ نیلوفر کو تو سوائے کھی کھی کے اور کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی ۔ مکان کا کرایہ چڑھتا چلا جا رہا ہے ۔ سلیم کا خرچ ہر مہینے بڑھتا جا رہا ہے ۔ لڑکیوں کا بل اگر دس تاریخ تک ادا نہ ہو جائے تو جینا دوبھر ہو جائے گا ۔ اتنا خرچ اور ڈیڑھ دو ہزار کی آمدنی — کیا ننگی نہائے ، کیا نچوڑے !

احسان صاحب کے پاس اس کے سوا اور کیا چارہ تھا

کہ صبح ہی صبح اٹھ کر کسی اسٹوڈیو کا رخ کرتے ۔ وہیں کسی پرانے جان کار آرٹسٹ کے میک اپ روم میں ڈٹ کر کسی بدنصیب پروڈیوسر کی قبر کھودتے ۔ ناشتہ کے بعد اسی آرٹسٹ کے ساتھ لگے سیٹ پر چلے جاتے ۔ کچھ لوگوں کو اب تک ان کی اصلی حالت کا اندازہ نہ تھا ۔ کسی زمانہ میں پروڈیوسر تھے ، ھاتھی لٹے تو بھی سوا لاکھ کا ، چھوٹے موٹے ایکسٹرا انہیں گھیر لیتے :

'' کہیے احسان صاحب پکچر کب شروع کر رہے ھیں ؟ ''

'' بس اب مہورت کرنے ہی والا ہوں ۔ کل دیوانند سے طے ہوگیا ۔ سنیل دت کو بھی رول پسند ھے ۔ ڈبل رول ھے ۔ ایک امیر لڑکے کا ، ایک غریب کا ، دونوں ھم شکل ھیں ۔ صاحب کمال کی اسٹوری ھے ۔ راجندر سنگھ بیدی سے ڈائلاگ کا ھو گیا ھے ۔ کسی سے کہنا نہیں ، کہانی دراصل مکھ رام شرما کی ھے ، مگر وہ اپنا نام کسی وجہ سے نہیں دینا چاہتے ۔''

جو انہیں جانتے تھے وہ سمجھ جاتے کہ زٹیں ھانک رہے ھیں ۔ انجان لوگ فوراً ان کی خاطروں میں لگ جاتے ۔ کیونکہ وہ فوراً کہتے :

'' ھیروئن کوئی نئی لڑکی لینا چاھتا ھوں ۔ '' اور تمام

نئی لڑکیوں کے رشتے دار انہیں راجہ اندر بنا کر گھیر لیتے :

" ارے بھائی چائے لاؤ احسان صاحب کے لیے ۔ لیجیے سگریٹ لیجیے ۔ ایک لڑکی ہے ، دیکھیے گا ؟ کیا یہ آپ کی مینا کماری اور وجینتی مالا ہیں ! لچھو مہاراج کی سدھائی ہے ۔ کتھک میں واقعی لچھو مہاراج کا جواب ہندوستان بھر میں نہیں ۔ بھئی کیا لڑکی ہے احسان صاحب ! "

" کون سی لڑکی ؟ "

" ہے ایک — آپ کسی دن ٹیسٹ لیجیے ۔ "

" وہ سریتا کا ذکر کر رہے ہو ؟ "

" ارے نہیں صاحب ۔ آپ بھی کیا باتیں کرتے ہیں ؟ سریتا سالی کا تو باپ بڑا دنگا کرتا ہے ۔ پرسوں نرائن صاحب کے سیٹ پر پی کر آ گیا ۔ بات بے بات گالیاں بکنے لگا کہ جان بوجھ کر زک دینے کے لیے ڈائرکٹر اسے ریہرسل میں بھیج رہا ہے ۔ ولین شاٹ میں بھیجے تو کوئی بات نہیں ، مگر یہ ڈائرکٹر فضول میں ریہرسل کے بہانے بے تکلف ہو رہا ہے ۔"

" ارے میاں وہ اس کا باپ نہیں ہے ۔ "

" مگر اس کی ماں سے سنا تھا شادی کر لی ہے ۔"

" شادی کیا ؟ ہاں ، شادی تو ماں ہی سے کی ہے ، مگر یار ایک دم سالی کباڑا ہے ۔ ماسٹر وٹھل کے ساتھ

سائیلنٹ فلموں میں ہیروئن ہؤا کرتی تھی ۔''

'' پہلے تو سریتاھی کے پیچھے لگا رہتا تھا ۔ اُس نے اسے کئی جگہ کام دلوایا ، مگر سالا ہمیشہ کا فسادی ہے ، ہر ایک کی کنٹی نیوٹی بگاڑ دی ۔ جس دن شوٹنگ ہوگی نخرے کرنے لگے گا ۔ سب جگہ سے نکالا گیا ۔''

'' اماں لعنت بھیجو سالی لکھپائی ہے ۔ ''

'' اوھو ! آئیے آئیے میڈم ۔ بھئی آپ تو عید کا چاند ہوگئی ھیں ۔ '' سربتا ایک بلوچن کا ڈریس پہنے ، اونچی ایڑیوں کی مدد سے پانچ فٹ دو انچ کا قد ٹھمکاتی ، الانگتی پھلانگتی چلی آ رہی تھی ۔ اُسے دیکھتے ہی گالیاں دینے والے ایک دم جادو نگری کے پری زاد کی طرح لوٹ پوٹ کر اُس کے عاشق صادق بن گئے اور ٹھنڈی آہیں بھرنے لگے ۔ یہ فلمی دنیا ہے ۔ یہاں ہر چیز مصنوعی ہے ۔ یہاں کالے کو گورا اور گورے کو کالا بنانے کے پلاسٹر ھیں ۔ گنجے سروں کے لیے وگ ھیں اور بال والے سروں کو گنجا بنانے کے لیے ربڑ کی ٹوپیاں ھیں ۔ چپٹی پھیلی ناکوں کو شیڈ دے کر پتلا ستواں بنوا لیجیے ۔ چندھی آنکھوں میں ستاروں کی لو بں کوٹ کر بھروا لیجیے ۔ بال چھدرے ھیں تو گنگاون حاضر ہے ، لمبی چوٹی جھولنے لگے گی ۔ بال لمبے ھیں تو رول بنوا کر انہیں باب فیشن کروا لیجیے ۔ دھانا چھوٹا ہے

تو چوڑی لپ سٹک چڑھا کر بھرپور بن سکتا ہے پوزیشن
پھیلا ہؤا ہے تو کناروں پر سے چھوڑ کر لپ سٹک لگوائیےکتا ،
ہیروئن ۔وکھی چھپٹی ہے تو ربڑ کے کولہے اور سینہ کسی
اعلا کیمسٹ کی دکان سے منگوا لیجیے ۔ اگر موٹی ہے ––
جو کہ ھر کامیاب ہیروئن چند فلموں کے بعد ہو جاتی
ہے –– تو اسے تنگ کپڑے پہنا دیجیے ۔ الاسٹک کی پٹیاں
باندھ دیجیے اور ناپ تول کر کیمرے کے اینگل لیجیے کہ
پتلی سلائی سی نظر آئے ۔ اگر ٹھنگنی ہے تو اسے چھ
انچی چار انچی اسٹول پر کھڑا کر دیجیے ۔ جو بہت لمبی ہے
تو ہیرو کے اسپیشل اونچی ایڑھی کے جوتے بنوا دیجیے ۔
عموماً لمبی ہیروئن کو ہیرو کے پاس کھڑا مت کیجیے، اس کے
پیروں پر گرائے رکھیے تاکہ ہیرو دیوزاد لگے ، جیسے نوتن
کے ساتھ اپنا راج لگتا ہے ۔

بات سریتا سے پھسل کر میک اپ کے ڈبے میں گر
پڑی ۔ جو ابھی آسے گالیاں دے رہے تھے فوراً اس کو
دیکھ کر گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے لگے ۔ خیریت اسی میں
ہے ۔ کون جانے آپ آج جسے اپنا چپراسی کہتے ھیں کل وہ
پروڈیوسر بن کر آپ کا پالن ہار بن جائے ۔ بڑے پروڈیوسروں
کا یہاں ذکر نہیں ، بلکہ ان ککرمتا قسم کے پروڈیوسروں
کا ذکر ہے جو کسی بارسوخ ھستی کے طفیلی ہوتے ھیں ۔

رے اسٹار کے گرد منڈلانے والے کوے ، جنہیں یہ
ر اپنا بلیک کا روپیہ وھائٹ کرنے کے سلسلے میں پروڈیوسر
ہا دیتے ہیں ۔ بلکہ یوں سمجھیے انکم ٹیکس سے بچنے کے
لیے اپنے فلم ان کے نام سے بناتے ہیں ۔ فلم انڈسٹری میں سب
کو اس دھندے کا پتہ ہوتا ہے ۔ ڈسٹری بیوٹر کو بھی
معلوم ہوتا ہے کہ اس فلم کا اصل مالک کون ہے اور
لفافہ کون ہے ؟

عموماً یہ لفافے کی ذات کے پروڈیوسر بظاہر کوئی
معاوضہ نہیں لیتے ۔ جتنا بھی گھپلا کرکے اڑا لیں وہ ان کی کمائی
ہے ۔ یہ لفافہ پروڈیوسر بڑے کام کا ہوتا ہے ۔ نام کو
پروڈیوسر اور ہر چیز کا یہی مالک ہوتا ہے ، مگر جیسے
انگلستان کے شہنشاہ کو تمام حقوق دے کر بھی کچھ نہیں
ملتا ، اسی طرح اس پروڈیوسر کو ایک ایسے کاغذ پر دستخط
کرنا پڑتے ہیں جس کی رو سے اس کی سات پشتیں تک گروی
ہو جاتی ہیں ۔ وہ رتی بھر بے ایمانی نہیں کر سکتا ۔ اگر فلم
کامیاب ہو جائے تو اصلی مالک ہر چیز پر قبضہ کر لیتا
ہے ، لیکن اگر فلاپ ہوجائے تو لفافہ عمر بھر کے لیے بیرنگ
ہو جاتا ہے ۔

یہ لفافہ عموماً بڑے کام کا ہوتا ہے ، حالانکہ عموماً
کڑکا ہوتا ہے ۔ اپنے رسوخ سے یہ تمام آرٹسٹوں سے ہاتھ

پیر جوڑکر، ناک رگڑکر پیسے کم کرواتا ہے ۔ وہ پوزیشن والا اصلی پروڈیوسر خود تو جا کر بھیک نہیں مانگ سکتا ، آپ بڑی شان سے ڈٹا رہتا ہے ، لفافہ کام نکالتا ہے ۔

پھر سریتا کے ذکر میں لفافی پروڈیوسر گھس آئے : آنہہ! ہٹائیے بھی سریتا کو ، یہ پہلے بھی کئی نام بدل چکی ہے ، مگر اس میں ہی برکت نہیں تو نام بے چارے کا کیا قصور ؟ ٹھنگنی سی مہاسوں دار لڑاکو مرغی کی طرح ہے ۔ اگر فلم لائن میں نہ ہوتی تو کہیں برتن مانجھتی بیٹھی ہوتی اور کوئی فلم بین اس سے آٹوگراف لینے نہ آتا ۔ اسے فلم لائن میں دیکھ کر خدا کی مصلحت کا قائل ہونا پڑتا ہے ۔ اگر یہ فلم میں مس کا کردار نہ ادا کرتی ہوتی تو اب تک یقیناً اپنی ہم شکل کتنی ہی لڑکیاں پیدا کر چکی ہوتی ، جو کسی طرح بھی ملک اور قوم کے معیارِ حسن کو اونچا نہ کرتیں ۔ شادی نہ کر کے وہ ہماری جانوں پر کچھ کم احسان نہیں کر رہی ہے ۔ مگر شادی تو وہ کر چکی ہے ، اُس شخص سے جو کبھی اُس کی والدہ کا آشنا تھا !

اتنے میں احمد بھائی آن پہنچے ۔ کچھ عرصے سے ان کا اور احسان میاں کا رشتہ کچھ آگ اور پانی کے رشتہ جیسا ہوگیا تھا ۔ ایک کا ہونا دوسرے کے لیے جگہ نہیں چھوڑتا تھا ۔ وہ کھسکنا ہی چاہتے تھے کہ احمد بھائی نے انہیں

پھانس لیا اور سیٹ کے پیچھے لے جا کر باتیں کرنے لگے ۔
'' میں نے پہلے ہی کہا تھا احمد بھائی یہ چھوکری تمھارے بس کی نہیں ۔ ''
'' پن چھوکری جو ایک دم کنڈم ہوئے تو اپن کیا کرے ؟ ''
'' سیٹھ چھوکری تو کنڈم نہیں ۔ یہ کیوں نہیں کہتے تم ہی کنڈم ہو تو کوئی کیا کرے ؟ '' احسان بھائی جل گئے ۔
'' کیا بات کرتا تم ؟ اکھا بمبئی کا چھوکری ہماری ٹانگ کے نیچو سے نکل گیا ۔ ''
'' وہ کوئی ٹکھیائی پون پل پر بیٹھنے والی ہوں گی ۔ سیٹھ یہ خاندانی لونڈیا ہے ۔ حماقت مجھ سے ہو گئی ۔ گاہک دیکھ کر مال کھپانا چاہیے — دوستی کا منہ کیا — ''
'' گرم کائے کو ہوتا بابا ؟ ''
'' آپ بات ہی ایسی بھونڈی کرتے ہیں ۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی ، لونڈیا نے لات مار دی اور آپ دو ہفتہ کے لیے ہسپتال میں جا پڑے ۔ ''
'' پن ہم کیا کرے ؟ تم بولو نا ! اس کا ماں تمھارے کو بوت مانتا ۔ ''
'' اماں تم تو سچ مچ گھاس کھا گئے ہو ۔ اس کی

ماں سالی کیا کرے گی ؟ ہاں تم کو ماں چاہیے تو ...''

'' کیا بکواس کرتا تم ؟ ہمارے کو یہ مخول پسند نہیں ۔ ''

'' ارے بھئی تو میں کیا کروں ؟ میں خود پریشان ہوں ۔ یہ سالی عورت ذات ۔'' احسان میاں نے ٹھنڈی سانس بھری ۔ '' اچھا سیٹھ مجھے ذرا کام ہے ۔ ''

'' بات تو سنو ۔ کیا سالہ آدمی ہے تم ۔ ''

''سیٹھ میرا اپوائنٹ مینٹ ہے ۔ مجھے دیو کو آج کہانی سنانا ہے ۔ سائننگ منی تیار ہے ، بس اگلے مہینے سے شوٹنگ ۔ ''

'' کیا تم ہمارے کو الو بناتا ہے ۔ ''

'' میں کیا بناؤں گا ، وہ تو خدا کی قدرت دیکھ ہی رہا ہوں ، اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے پروردگار نے ! ''

'' ایں ؟ ''

'' جانے دیو تم نہ سمجھو گے ۔ ''

'' ہمارے پیسے کا ۔کیا تم کچھ ارینج مینٹ ؟ ''

'' ہو جائے گا ، وہ بھی ہو جائے گا ۔ اچھا تو چلوں ۔ تمہاری نظر میں کوئی اچھی سیکنڈ ہینڈ گاڑی ہووے تو ... '' احسان صاحب نے گپ لگائی ۔

'' تم گاڑی لیتا ؟ ''

"گاڑی کے بغیر بڑی تکلیف ہے۔"

"سالا گاڑی کا پیسہ ہے تمہارے پاس تو ہمارا پیسہ کائے کو نہیں دیتا۔" احمد بھائی گرم ہو گئے۔

"اے بھئی میں تو گاڑی نہیں لے رہا۔ وہ اپنا دیپ چند ہے نا، سورج مل کا سالا، آسے چاہیے۔" احسان صاحب فوراً پلٹ گئے۔

"ہم سب جانتا۔ سالہ تم اس کے نام سے اپنا گاڑی لیتا۔ تم کمپنی کس کا نام سے اسٹارٹ کرتا ؟"

"میرا ایک بھتیجا ہے — وہ ..."

"کیا تم لوگ چار سو بیسی کرتا ؟ ادھر ایک کمپنی پھٹ ہوتا آدھر تابڑ توپ دوسرا کمپنی چالو کر دیتا۔ اچھا بیٹا سمجھے گا تم کو۔ انسالوینٹ کرا کے دم لے گا۔"

"ارے واہ سیٹھ! اپن تو چار سال ہوا انسالوینٹ ہوگیا۔ روپیہ تو تم نے غلام رسول کو دیا تھا، اب میرے سے مانگ رہے ہو۔"

"تم بولا غلام رسول کا نام ڈالتا، پن روپیہ ہم دے گا۔"

"آنہہ! یہ تو وہی مثل ہو گئی: طویلے کی بلا بندر کے سر۔ لونڈیا کا غصہ مجھ غریب پر آتار رہے ہو۔ میری مانو تو سیٹھ بادام گھس کے جوارش جالینوس کے سنگ کھاؤ۔ انشاءاللہ..."

"کیا بادام کھاوے۔ سالہ ہمارے کو جلاب آنے

کو لگتا ۔ '' سیٹھ بڑی حسرت سے بولے تو احسان صاحب کو ہنسی آ گئی ۔

'' اے سائیلنس ! کون آلو کا پٹھا سیٹ کے پیچھے بول رہا ہے ؟ نکالو جوتے مار کے ۔ اتنا لمبا شاٹ خراب ہوگیا ۔ اوہو ! آپ ہیں احسان صاحب ! معاف کیجیے گا ۔ '' مگر جب احسان صاحب '' کوئی بات نہیں '' کہتے ہوئے چلے گئے تو ڈائرکٹر نے جی بھر کے گالیاں دیں : '' چور زمانے بھر کے ۔ مجھے ڈائرکشن دینے کا وعدہ کیا اور کمبخت نے سال بھر دوڑایا ، معلوم ہؤا بالکل کڑکا ہے ۔ '' ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ڈائرکٹر احسان صاحب کے ساتھ مل کر باقی کی انڈسٹری والوں کو گالیاں دے رہا تھا :

'' ارے صاحب یہ شریفوں کی لائن نہیں ۔ یہاں تو بس رنڈیوں اور بھڑووں کی دال گلتی ہے ۔ ''

جیسے احسان کوئی فرشتہ تھے ۔ وہ خود اسی ڈائرکٹر کے بارے میں ہر ایک سے کہتے پھرتے تھے کہ اپنی بیوی کی سفارشوں سے ڈائرکٹر بنا پھرتا ہے ۔ اگر ڈائرکٹر نہ بنایا جائے تو موقع بے موقع حق شوہری جتانے پر مصر ہو جاتا ہے ۔

ان شوہر یا ڈائرکٹر صاحب کی بھی بڑی لطیف کہانی تھی ۔ میاں بیوی اچھے خاصے تعلیم یافتہ طبقے سے تھے ۔

امپیریل تھئیٹر میں دل بہلانے کو کام کیا کرتے تھے ۔ نہ جانے کس نے بھڑکا دیا کہ فلم لائن میں جاؤ ، گنگا بہہ رہی ہے ، چنانچہ آ گئے ۔ مختلف دوستوں کے ہاں رہے ۔ آرٹ سے دلچسپی رکھنے والے گروہوں سے ملے ، جہاں کام مل سکتا ہے مگر دام نہیں ۔ بمبئی میں مہمان داری کب تک چلتی؟ لہذا ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے۔ بیوی ہر ایک پروڈیوسر کے پاس جاتیں ۔ میاں کا دکھڑا سنا کر اُس کے شانے پر آنسو بہاتیں ۔ چھوٹا موٹا کام مل جاتا ، جسے یہ اپنی کوششوں سے بڑھوا لیتیں ۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ روحانی دوستیاں کرتی ہیں ۔ مگر بھلا فلم انڈسٹری والے بھوت چڑیل میں کب ایمان لانے والے ہیں ؟ اب میاں کو احساس کمتری ہو رہا ہے کہ وہ اپنی بیوی کے شوہر کے سوا اور کچھ نہیں مانے جاتے ۔ لہذا وہ اُن سے لڑتے ہیں ۔ جان عذاب میں کر دیتے ہیں۔ جس فلم میں کام کر رہی ہوں اس میں کھنڈت ڈالنے پر تیار ہو جاتے ہیں کہ ان کا سارے اسٹاف سے عشق چل رہا ہے اور وہ ایک سرے سے سب کے جوتے مارنے والے ہیں۔ بیوی اُن کا نفسیاتی تجزیہ کر کے پھر اپنے افلاطونی مہربانوں کے سینے پر سر رکھ کر روتی ہیں اور جب تک انہیں کام نہ مل جائے وہ اسی طرح دھمکیاں دیتے رہتے ہیں۔ مگر جب کام مل جاتا ہے تو فوراً ہیروئن

یا سائیڈ ہیروئن سے عشق لڑانے لگتے ہیں۔ اگر کاسٹ اے ون ہو تو پھر ڈانسر یا سائیڈ ڈانسر ہی پر صبر کر لیتے ہیں۔ پھر وہ حسد ہی میں جلا کرتی ہیں اور اپنے رومانی دوستوں کے شانے آنسوؤں سے تر کرتی ہیں۔ اللہ نے ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کے کبھی نہ خشک ہونے والے سوتے چھپا دیے ہیں۔ آج کل ان کے میاں کا عشق سریتا سے بڑی دھوم دھام سے چل رہا ہے۔ بیگم صاحبہ کو یہی غم کھائے جاتا ہے۔ اگر سریتا کی جگہ اس وقت کوئی بڑی ہیروئن ہوتی تو آن کی ذلت نہ ہوتی — بلکہ تب تو شاید وہ خود آن پر مرنے لگتیں۔ تھرڈ کلاس لڑکی پر مرنے میں نقصان ہی نقصان ہیں۔ فرسٹ کلاس ہیروئن سے معاملہ ہو تو جانو ریزرو بنک کی کنجی ہاتھ آ گئی۔ بڑی سے بڑی دعوت ہو، اگر انہیں بلا وہ نہ آئے تو ہیروئن بھی نہیں جاسکتی۔ چاہے دس کمپنیاں چالو کر کے پروڈیوسر کے باپ بن جاؤ۔ جتنا بلیک کا روپیہ ہے وہ تو خیر اپنا ہے ہی، وھائٹ کی بھی کوڑی کوڑی ھضم کر لو۔ جو وہ کماتی جائے طرح طرح سے اڑاتے ہی جاؤ یا اپنے نام سے جمع کرتے جاؤ۔ جب بوڑھی ہو جائے تو کوئی نئی چڑیا پھانسو۔ یہ حسن وعشق کے سین میں گرم سانسیں بھرنے والی صفِ اول کی ہیروئنیں خشک ریت میں غوطے مارا کرتی ہیں۔ انہیں دنیا ہوس کی

نگاهوں سے گهورتی هے ہر دل دینے والا کوئی نہیں جڑتا ۔ ایک دفعہ یہ شادی کرلیں تو پھر جنگل سے نہیں نکل سکتیں ۔ جو نکلتی هیں تو چولھے میں سے نکل کر بھاڑ میں گر جاتی هیں ۔ تھرڈ کلاس چھوکری هو تو فنانسر پٹھے پر هاتھ نہیں رکھنے دیتا ۔ اور سریتا زندگی میں چاهے شعلۂ جوالا هو ، سکرین پر بونبل مچھلی هی لگتی تھی ۔ مگر جس تیسرے نمبر کے پروڈیوسر کا وہ ساتھ دے جاتی ، اسے کچھ نہ کچھ فنانس کہیں سے ضرور دلا دیتی ۔ اس وقت اُس کا ڈانس هو رها تھا : ایک کیفے میں وہ هیرو کو راہ بد کی طرف لے جانے کے لیے اپنے تمام دھار دار حربے استعمال کر رهی تھی ۔ کیفے میں جؤا چل رها تھا اور وہ سب کے پاس دوڑ دوڑ کر اینڈ رهی تھی ، هونٹ کاٹ کاٹ کر چھاتیاں تھرکا رهی تھی ، مگر یہ ساری حرکتیں سیٹ پر بیٹھے هوئے ایکسٹرا آرٹسٹوں کے لیے بالکل مشین کی کھٹ کھٹ بن چکی تھیں ۔ کسی کے جذبات برانگیختہ نہیں هورهے تھے ۔ مشینوں کے ساتھ کام کرتے کرتے انسان بھی مشین بن جاتا هے ۔ شدید گرمی ، دھول ، پگھلتا هؤا میک اپ — اور پھر مفت کام کرنے کی وجہ سے دل بجھے هوئے تھے اور سارے جذبے سو گئے تھے ۔ کیونکہ سارے آرٹسٹ اس فلم میں اس شرط پر کام کر رهے تھے کہ بزنس هوگی ، تب بے منٹ هوگا ۔

مگر لوگ گندے مذاق کر رہے تھے ۔ سریتا کا سکرٹ خوب گھیر دار تھا ۔ جب وہ لٹو کی طرح چکریاں لیتی تو اس کا گھیرے گلابی رنگ کا جانگیا خطرے کی جھنڈی بن کر چمک جاتا ۔ اسسٹنٹ کیمرے کے نیچے بیٹھا کلیپر پر شوٹ نمبر اور تاریخ وغیرہ ڈال رہا تھا ۔ ہیئر ڈریسر لسی پینے کے بعد اب پان کھا رہی تھی، تاکہ فائینل ریہرسل سے پہلے ہیئر پن اور ویور نکال کر بال جمادے ۔ پروڈیوسر کا خون سب پر حلال ہے ۔ چاہے سین میں بال بکھیرنے ہی کیوں نہ ہوں ، ہیئر ڈریسر بلوائی جاتی ہے ۔ اورچونکہ نرگس اور مدھو بالا کی ہیئرڈریسر ہے ، اس لیے ہر دو پیسے کی چھوکری پہلے ہیئر ڈریسر بلواتی ہے ، جو بال کم بناتی ہے ، اس کی آیا گیری زیادہ کرتی ہے ۔ ساری انڈسٹری کی خبریں نائی س کی طرح آسے معلوم ہوتی ہیں ۔ جتنی منہ چڑھی ہیروئن ہوگی ، اتنی ہی بد دماغ اس کی ہیئر ڈریسر ہوگی ، کیونکہ وہ آس کی ہم راز اور پیغامبر بھی ہوتی ہے ۔ وہ عشق چلواتی ہے ، چٹھی پتر لےجاتی ہے ۔ ہیروئن کو روپیہ ڈھالنے کی مشین سمجھنے والے رشتہ داروں ، ماؤں ، نانیوں اور شوہروں کے دکھڑے سنتی ہے اور اس کے ساتھ باتھ روم تک جاتی ہے ۔ مثنامسٹنٹوں کو یوں اکڑوں محو نظارہ دیکھ کر ڈائرکٹر صاحب نے بھی جھک کر دیکھا اور جانگیے کی چمک دمک دیکھ کر

چراغ پا ہو گئے۔

''میرے سیٹ پر یہ بیہودگیاں نہیں چلیں گی۔'' وہ بری طرح گرجے۔ ''بیٹھے گدھوں کی طرح دیکھ رہے ہیں۔ سنسر ایک دم یہ شارٹ اُڑا دے گا۔ جاؤ اسے لمبا انڈر ویئر پہناؤ۔''

سریتا کو جب معلوم ہؤا تو اداس ہو گئی۔

مگر اسسٹنٹ سفارش کرنے لگے۔ فلاں فلم میں تو اس سے بھی چھوٹا ہے اور بالکل جسم کی کھال کی رنگت کا ہے، چھوکری بالکل ننگی دکھائی پڑتی ہے۔ ڈائرکٹر چڑ گیا۔ اُسے معلوم تھا کہ وہ بالکل ننگی دکھائی پڑتی چھوکری کی فلم سنسر والوں کی قینچی سے کیوں کر بچ گئی تھی۔ وہ پروڈیوسر ہمیشہ انتہائی قابلِ اعتراض چیزیں اپنی فلم میں بچا لے جاتا تھا۔ جس کی پہنچ ہو وہ سب کچھ رکھ سکتا ہے اور سنسر کی قینچی کترا کر نکل جاتی ہے، ایک فریم نہیں کٹتا۔ مصیبت ان چھوٹے چھوٹے پروڈیوسروں کی ہے۔ لفافہ قسم کے پروڈیوسر، جو سنسر کی قینچی سے ایسے لرزتے ہیں جیسے بچھیا قصائی کی چھری سے۔ اور چھری بھی کیسی کہ اندھے سانڈ کے سینگ، جہاں جی چاہا بھونک دے۔ کیسا بھیانک نظارہ ہوتا ہے۔ اندر سنسر ٹرائل ہو رہا ہے باہر پروڈیوسر کو ڈائریا۔ مہینہ بھر سے ایڈیٹنگ کے چکر میں سر پیر کا ہوش نہیں رہا۔ کب فلم ختم ہوگی؟

کسی کا پورا پیسہ نہیں چکایا ۔ ہاتھ پیر جوڑ کر، بیوی بچوں کو پیروں میں ڈال کر کسی طرح فلم ٹھوک دی ۔ سوائے ایڈیٹر کے اور ڈائرکٹر کے اور ان دونوں اسسٹنٹوں کے سب کا کام ختم ہو گیا ۔ دلچسپی ختم ہو گئی ۔ آدھر ڈسٹری بیوٹر سولی پر چڑھائے دے رہا ہے ۔ خدا خدا کر کے ایڈیٹنگ ختم ہوئی، ادھر ادھر سے مسانگ تانگ کر بیک گراؤنڈ میوزک ڈالا اور میت سجا کر سنسر کے آگے رکھ دی ۔ جانو بیٹی منڈپ میں بٹھا دی ہے ۔ ایگزبٹر دھمکیاں دے رہا ہے کہ پکچر دو، ورنہ ایڈوانس ہضم ۔ اس پر پروڈیوسر دم گھونٹ رہا ہے کہ مقررہ ڈیٹ پر ڈلوری نہیں دی تو دام واپس کر دو ۔ کرمنل کیس کر دیا جائے گا ۔ آدھر پچھلی فلاپ فلم کے قرض دار گردن پر سوار ہیں کہ اگر ایک بوند بھی ٹپکے تو لپک لیں — اور سنسر کے پجاری ہاتھوں میں نشتر تولے لاش پر جھکے ہوئے ہیں ۔

قسمت کا فیصلہ ہو جاتا ہے ۔ صرف تین ہزار فٹ فلم کٹی گئی ۔ دو گانے سورگ باش ہوئے ۔ تین گانے بری طرح زخمی کہ شاید پلاسٹک سرجری سے سسکتے رہ جائیں ۔ بیچ بیچ میں سے ڈائلاگ اور الفاظ اچک لیے گئے ۔

لیجیے فلم سنسر ہو گئی ۔ بہت لڑے تو بالکل جھاڑی والوں جیسا سودا پٹ گیا : ہارا نہ تمہارا، بس آدھا آدھا ۔ یعنی

فلم صرف ڈیڑھ ہزارفٹ کٹی - آگے پھر مورچہ تیار کیا ، دلی لڑنے چلے - اس کمیٹی کو دکھایا ، اس کمیٹی کو دکھایا - اب یا تو ایک دم فلم کوری نکل آئی ، صرف دو چار سو فٹ فضول چیزیں نکل گئیں، فلم پاس ہو گئی - اور اگر روائزنگ کمیٹی میں کوئی جنات قسم کے صاحب ہوئے تو فلم بالکل ایک سرے سے بین ہو گئی - کوئی بھروسہ نہیں سنسر کا - سب کسی اندھی قدرت کے ہاتھ میں ہے - تیر نہیں تو تکا تو ہے ہی - کبھی تو معلوم ہوگا فلاں پکچر بین ہو گئی — اور پھر خبر آئے گی کہ اسے تو پریسیڈنٹ اوارڈ ملتے ملتے بچ گیا اور بہت سے فلمی میلوں میں انعامات لینے جا رہی ہے -

'' مجھے گرمی لگتی ہے - '' سربتا دیوی جانگیہ بدلنے پر تیار نہیں تھیں - وہ سیٹ پر بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہروں پر کھلتی ہوئی کہکشاں دیکھ رہی تھیں - جب ان لوگوں کی اوپر کی سانس اوپر ، نیچے کی نیچے رہ جاتی ہے تو پبلک کا کیا ہوگا ؟ ختم ہی تو ہو جائے گی ! یہ ڈائرکٹر لوگ ان کے دشمن تھے - ان کی سیکس اپیل کو جان بوجھ کر ضائع کر دیتے تھے - بات یہ تھی کہ ان دنوں سربتا بائی اس بے دردی سے سنسر والوں کے ہاتھوں کٹنے لگی تھیں کہ ڈائرکٹر انہیں فلم کے حق میں زہر قاتل سمجھتے ، اور پبلک کا

یہ حال تھا کہ اگر ایک شاٹ بھی ان کا کولھے مارنے کا ، کندھا مارنے کا یا جھر جھری لے کر ھونٹ چبانے کا نظر آ جاتا تو دیوانے ھو کر وھیں لوٹ جاتے ۔ وہ فلم عموماً ہٹ ھو جاتی ۔ ان کے سینے کی ایک تھرتھراھٹ دیکھنے کے لیے لوگ لاکھوں نچھاور کر دیتے ۔

” اچھا تو آج کلوز شاٹ ھو جانے دو ۔ “ ڈائرکٹر ٹال گیا ۔

کلوز شاٹ میں ذرا نیچے کیمرہ رکھا تو وہ کچھ ایسے گھس کر اور آگے کو جسم پھینک کر کھڑی ھوئیں کہ کیمرہ مین سر ھلانے لگا :

” نہیں چلے گا ۔ “

” اماں کیا نہیں چلے گا ؟ “ ڈائرکٹر چڑ گیا ۔

” دیکھیے پہلے — پھر بولیے گا — میرا کیا ھے ؟ مگر سوچ لیجیے ۔ “

” آف ! ذرا پیچھے ھٹو ۔“ کیمرے میں جھانک کر بولا ، ذرا لیفٹ کو — بس بس — تھوڑا رائٹ — بس — ھیں ؟ “ ڈائرکٹر نے کیمرہ مین کو دیکھا — پھر اسسٹنٹ کو دیکھا — پھر سریتا بائی کو دیکھا اور احمقوں کی طرح سر کھجانے لگا ۔

” لائٹ آف ۔“ روشنیاں بند کر دی گئیں ، میک اپ

مین کو بلایا گیا ۔

'' صاحب مجھے کچھ نہیں معلوم ، ڈریس والے سے پوچھیے ۔'' میک اپ مین نے کہا ۔

'' صاحب وہ بات یہ ہے : میں نے بہت روکا ، وہ مانیں ہی نہیں ۔ ''

'' کیا مطلب ؟ ''

'' وہ قمر ہے نا — وہ لے گئیں ۔ ''

'' تو پھر ؟ اپنی پراپرٹی میں نہیں ؟ ''

'' ہیں صاحب ، وہی تو ہیں — وہ '' سپر پرستان'' والے لے گئے تھے ۔ اُن کے یہاں سے بدل کر دو سائز کے آ گئے ۔ شوٹنگ کے بعد کل گیا تھا ، انھوں نے کہا : کہیں پراپرٹی میں پڑے ہیں ، پھر بدل لے جانا ۔''

'' مگر یہ دو سائز کے تو نہیں چلیں گے ۔ '' ڈائرکٹر اڑ گیا ۔

''اچھا بھئی بیک شاٹ لےلو ۔'' پروڈیوسر نے خوشامد کی ۔

'' میک اپ ! '' سریتا بائی بیک شاٹ کے لیے تیاری کرنے لگیں

نیلوفر ، جو کبھی معصومہ بانو تھی ، جو گڑیوں سے

کھیلتی تھی اور الدھیرے سے ڈرتی تھی ، ہر برسات میں نیم کے پیڑ میں جھولا ڈال کر لمبے پینگ لیا کرتی تھی ، جسے بہت سے شعر یاد تھے اور بیت بازی میں ہمیشہ آسی کی پارٹی جیتا کرتی تھی ، جب ڈرامہ میں اوفیلیہ کا کردار ادا کیا تھا تو سارے اسکول کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہنے لگی تھیں۔

آسے شیلے سے عشق تھا اور کیٹس پر دم جاتا تھا۔ بائرن کے نام پر دل دھڑکنے لگتا تھا۔ انہیں جتنا کچھ پڑھا اور سمجھا تھا ، آسی پر دل دے بیٹھی تھی۔ باوا کہتے تھے : چھوما کو ولایت بھیجیں گے - سینیر کیمبرج کر لیتی تو پھر کیا تھا !

مگر یہ خواب تھے — بڑے بڑے جاندار خواب — جن میں اب بھی معصومہ بانو آلجھی معلق لٹک رہی تھی ۔ مگر نیلوفر اس جال سے پھسل آئی تھی - وہ زیادہ تر چاکولیٹ اور ٹافیاں چبایا کرتی - چیختے چنگھاڑتے ربا سمبا کے ریکارڈ بجا کر ڈنلو پلو کے موٹے گدوں پر پڑی تھرکا کرتی۔ اس کے ارد گرد " ٹرو سٹوری " ، " ٹرو رومان " اور مختلف قسم کی لڑکیوں کے کنفیشن پڑے رہتے ۔ آس کا دبلا پتلا جسم بڑی تیزی سے بھرتا جا رہا تھا ۔

" یہ کیا طریقہ ہے ؟ " بیگم نے آس کے ننگے کولہے

پر تھپڑ لگایا ۔

'' اوں ھمیں گرمی لگتی ھے ۔'' اوندھے پڑے پڑے اُس نے تکلفاً ذرا چادر اپنے اُوپر گھسیٹ لی اور ایک موٹا سا چاکولیٹ چبانے لگی ۔ پڑوس کے بچے اگاسی کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے جھانک رھے تھے ۔ ابھی بیگم نے سب کو اُدھر سے مار کر ھنکایا تھا ۔

'' تو اب کیا ارادہ ھے ؟ '' انہوں نے ایک کرسی پر سے بلاؤز اور اُلجھی ھوئی ساڑھیوں کا ڈھیر پلنگ پر پھینک کر جگہ بنائی اور ٹھس سے بیٹھ گئیں ۔ ادھر چند مہینوں میں کچھ اور گوشت چڑھ آیا تھا ۔

'' پنچگنی سے آج آخری نوٹس آیا ھے ۔''

'' روپے نہیں بھیجے آپ نے ؟ ''

'' کہاں سے بھیج دیتی ۔ یہ تیسرا مہینہ ناغہ ھؤا ھے ۔''

'' کاھے کا ؟ '' نیلوفر نے کھوئے ھوئے انداز سے یونہی کہہ دیا ۔ وہ کہانی کے ازحد دلچسپ حصہ پر پہنچ چکی تھی ۔ وہ شخص ، جس نے کہانی کی ھیروئن کو خراب کر کے اُس کے بچہ پیدا کروا دیا تھا ، اب اُس کا ضمیر ملامت کر رھا تھا اور کوئی دم میں وہ آسے اپنی مضبوط باھوں میں لے کر شادی کا وعدہ کرنے والا تھا ۔

'' میں کہتی ہوں آگ لگے ان کتابوں کو ۔ '' انہوں نے کتاب چھیننا چاہی ، مگر نیلوفر نے جھٹ سے چادر کے اندر چھپا لی اور ہنسنے لگی ۔

'' بے شرم کہیں کی ۔ ہر وقت گندی گندی کتابیں پڑھتی رہتی ہے ۔ انہوں نے تو تجھے کوڑی کام کا نہیں رکھا ۔ قسم سے ایک دن سب کو اکٹھا کر کے آگ لگا دوں گی ۔''

'' اوں بھئی کیوں ؟ ''

'' کیوں کی بچی ۔ کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ احمد بھائی ہاتھ سے نکل گیا تو پھر کیا ہوگا ؟ ''

نیلوفر احمقوں کی طرح ہنس دی ۔ سوچنا اس نے عرصہ ہؤا چھوڑ دیا تھا ۔

'' تو ہم کیا کریں ؟ ''

'' یہ تو پرسوں ورسووا کس کے ساتھ گئی تھی ؟ ''

'' کسی کے ساتھ بھی نہیں ۔ ''

'' اور اوپر سے جھوٹ بولتی ہے ! '' بیگم نے جھونٹے پکڑ کر اس کا منہ اپنی طرف موڑا ، نیلوفر ایک جھٹکا مار کر چھوٹ گئی ۔ احمد بھائی سے کشتیاں لڑ لڑ کر اسے نئے نئے پینترے آ گئے تھے ۔

'' منوہر کے ساتھ اور کس کے ساتھ ۔ '' اس نے ہاتھ اونچے کر کے بال سمیٹے تو چادر چھوٹ گئی ۔ بیگم کو

اس کی بے حیائی پر غصہ آ گیا ۔ ڈر کر اس نے ڈریسنگ گاؤن گھسیٹ کر اوڑھ لیا ۔

’’ شرم نہیں آتی ۔ رنڈیوں کی طرح ہر کسی کے ساتھ چل دیتی ہے ۔‘‘ بیگم آسے احمد بھائی پر رحم کھانے کی نصیحت کرنے آئی تھیں ، مگر منوہر کے ساتھ اس کا جانا آوارگی کا ثبوت تھا ! منوہر ، جو ابھی سیکنڈ ایئر میں پڑھتا تھا ، پڑوس کے ایک ماسٹر جی کا آوارہ لونڈا تھا اور ہر وقت کھڑکی میں سے نیلوفر کو اشارے کیا کرتا تھا ۔

عجب ستم ظریفی تھی یہ نیلوفر کی ۔ وہ کچھ اس سے چھوٹا ہی ہوگا ۔ دبلا پتلا ، پھرتیلا سا لڑکا ۔ میدان میں کرکٹ کی مشق کرتے وقت وہ نیلوفر کو دیکھتے ہی مردانگی دکھانے لگتا ۔

اس کے کمرے کی کھڑکی نیلوفر کے کمرے کے ساتھ تھی ۔ عموماً اس کے پردے دروازے پر موڑ کر ڈال دیا کرتی تھی ۔ وہ بظاہر کتاب لے کر سامنے بیٹھا رہتا اور نیلوفر اپنے کمرے میں آزادی سے چہل قدمی کیا کرتی ۔ منوہر منہ پھاڑے دیکھتا رہتا اور کتاب اس کے ہاتھ سے نیچے گر جاتی ، تب بھی اسے ہوش نہ آتا ۔

ایک دن اس نے جان بوجھ کر اپنا چاندی کے دستے والا برش کھڑکی سے گرا دیا اور جھک جھک کر دیکھنے

لگی ۔ منوہر تیر کی طرح تین تین سیڑھیاں پھلانگتا دوڑا ۔ برش لے کر وہ جب نیلوفر کے کمرے میں آیا تو بیگم کہیں پڑوس میں گئی ہوئی تھیں۔ وھی دروازہ کھلا چھوڑ گئی تھیں۔

وہ لوٹیں تو نیلوفر کے کمرے کا دروازہ بھاڑ کی طرح کھلا تھا اور چنے بھن رہے تھے ۔ انہوں نے وھی برش لے کر منوہر کے کولھوں پر جو کس کس کر جمایا تو وہ بھاگا دم دبا کر ۔ مارے ھنسی کے نیلوفر کو اچھو لگ گیا ۔ کس قدر مضحکہ خیز نظارہ تھا کہ ھنسی روکے نہ رکتی تھی۔ بیگم کی آنکھوں میں خون اتر آیا ۔ وھی برش لے کر وہ لپکیں ، مگر ایک چھلانگ مار کر وہ کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی ۔ وہ جانتی تھیں کہ اگر وہ آگے بڑھیں تو اسی بہشتی جوڑے میں وہ دھم سے پڑوس کی چھت پر کود پڑے گی ۔ لوگوں کو ویسے ھی ان کے چال چلن پر اعتراض ہونے لگا تھا ، مگر زیادہ نہیں ، کیونکہ فلمی علاقہ تھا ، جہاں آئے دن ھو حق مچا رھتا تھا ۔ لاچار ھوکر وہ سر پکڑ کر کرسی پر گر پڑیں اور منہ ڈھانپ کر رونے لگیں ۔

مگر جب نیلوفر دھم دھم پیر پٹختی غسل خانے میں جانے لگی تو وہ سب کچھ بھول کر اس فکر سے پریشان ھو گئیں کہ یہ کوئی کپڑا ڈھنگ سے نہیں پہنتی ، گوشت بڑھتا رہا رھا ہے ۔ یہی حال رھا تو کچھ ھی دنوں میں ڈھل جائے

گی ۔ وہ کتنی تیز رفتار سے عقل مند ہو رہی تھیں ۔ بدی کتنی جلدی اور آسانی سے انسان میں رچ جاتی ہے ۔ نیکی کی تلقین کے لیے بڑے بڑے اوتار اور پیغبر سر پٹک کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور ہار گئے ۔ بدی دلچسپ ہے ، ہنگامہ خیز ہے ؛ نیکی کٹھن لوہے کے چنے چابنے کی طرح ہے ۔ ساری عمر کی تربیت رانگے کی قلعی کی طرح دو چار تاؤ لگنے سے اتر گئی ۔

مگر بے چاری نیکی کا اس میں قصور تھا نہ بدی کا ۔ ملمع دہ ماحول تھا جس میں بیگم پلی تھیں ۔ روزے بھی تھے ، نمازیں بھی تھیں ، حج اور زکواۃ بھی — مگر اس کے ساتھ ساتھ چھپ کر رنڈی بازی اور حرام کاری تھی ۔ دنیا کی نظر سے چھپا کر جو عیب کیے جائیں اس سے اور کوئی نہیں مگر اولاد تو واقف رہتی ہی ہے ۔ حضور اعلا کی کتنی بیویاں ، باندیاں ، داشتائیں تھیں ۔ کیا سب کو خوش رکھنا ان کے بس کی بات تھی ؟ مگر سب ہی زندہ تھیں اور انسان تھیں ۔ صاحب زادیوں کی بھی شادیاں نہیں ہوئیں ۔ کیا وہ سب کی سب کنواری تھیں ؟ جو اس بڑھاپے میں سال میں کتنے ہی بچے ہوتے تھے ، کیا اُن کی ماؤں کے علاوہ کسی دوسرے کو اُن کے باپوں کا پتہ نہیں معلوم تھا ؟

یہ اعلا حضرت کی دانش مندی تھی یا پیدائشی

کنجوسی کہ حال ہی میں اسٹیٹ گزٹ میں اعلان فرما دیا کہ اب ہم بہت ضعیف ہو چکے ہیں ، لہذا آئندہ محل میں جو بچے پیدا ہوں وہ ہمارے نہ تصور کیے جائیں ۔

جاگیرداری نظام کی تمام لعنتیں سوئی پڑی تھیں ۔ فاقوں اور غربت نے انہیں رگوں میں پھر زندہ کر دیا ۔ اگر بیگم درمیانہ طبقے کی کمزوریوں میں جکڑی ہوتیں تو بجائے بیٹی کا سودا کرنے کے سلائی کر کے پیٹ پالتیں ۔ لڑکی کو کسی اسکول میں چھوٹی موٹی نوکری مل جاتی ۔ روکھی سوکھی میں گزر کرتیں تو زیور ہی کئی سال ساتھ دے جاتا ، مگر تنگی ترشی کی نہ تو انہیں عادت تھی اور نہ ہی کبھی کسی کو کرتے دیکھا ۔ ہاں لڑکیوں کے سودے تو پشتوں سے ہوتے چلے آئے تھے ۔ ان کی جوان خالہ بڈھے بھونس نواب قمرالدین کو پیسے کی خاطر بیاہی گئی تھیں ۔ کھلے بندوں ان کا سول سرجن صاحب سے تعلق تھا ۔ خود ان کی بڑی کے شوہر نے ایک میم سے شادی کر لی تھی ۔ اس کا غم وہ ایک شاعر کی آغوش میں غلط کرتی تھیں ۔ عزت اور شرافت کا پیمانہ تھا دولت اور مرتبہ !

تو پھر وہ کون سا ایسا پاپ کر رہی تھیں جو انہیں ندامت ہوتی ۔ پھر بمبئی میں کون پوچھتا ہے کہ تم کون ہو ؟ کیا ذریعۂ معاش ہے ؟ کون اپنے گریبان میں منہ ڈال

کر کہہ سکتا ہے کہ وہ اچھوتا انسان ہے ، جس نے کبھیؑ کوئلوں کی دلالی نہیں کی !

بیگم کو معلوم تھا نیلوفر چھپ کر منوہر سے ملتی ہے ۔ آسے لیے پھرتی ہے ۔ اس پر پیسے خرچ کرتی ہے ۔ ڈھلتی عمر میں اگر آسے یہ لت ہو جاتی تو ایک بات بھی تھی ، مگر چڑھتی جوانی میں تو کسی کو یوں بچوں کے ساتھ کھیلتے نہیں دیکھا ۔

جب وہ اندر سے کمر بند باندھتی نکلی تو انہوں نے پھر اس کی ٹانگ لی ۔

”منوہر سے شادی کر لوں گی ۔ “

جیسے بیگم کو سانپ نے ڈس لیا ۔

”شادی کر لو گی — اور کھاؤ گی کیا ؟ آس کے باوا کا سر؟ کچھ دماغ خراب ہؤا ہے !“

گھنٹوں چخ چخ ہوتی رہی ۔ بیگم روئیں ، پھر نیلوفر روئی ، پھر بیگم کے آنسو جیت گئے اور نیلوفر نے وعدہ کر لیا کہ اب وہ منوہر سے نہیں ملے ؒ۔ مگر بیگم کے دل میں دگدا لگا ہؤا تھا ۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے ہاں اپنی سوجی ہوئی داڑھ کے لیے دوا لینے گئیں تو وہیں اشارتاً کہہ دیا :

”بچہ آپ کا پڑھتا لکھتا نہیں ، میری لڑکی کا بھی وقت خراب کرتا ہے ۔ کچھ کیجیے ۔“ اور انہوں نے اسے شولا پور

پارسل کر دیا ۔

نیلوفر منہ پھلائے ، دروازہ بند کیے پڑی رہی ۔ احمد بھائی بھنڈی بازار سے نان کباب لے کر آئے مگر اس نے دروازہ نہیں کھولا ۔ اتفاق سے اس دن بھولے بھٹکے احسان صاحب بھی آ نکلے ۔ احمد بھائی کو دیکھ کر آلٹے پاؤں لوٹنے والے تھے ، مگر پکڑے گئے ۔

احمد بھائی جلے ہوئے تو تھے ہی ، تھوڑی دیر میں ہی دونوں میں گالی گلوچ ہونے لگی ، مگر کھل کر نہیں ۔ جب بیگم اٹھ کر ادھر آدھر جاتیں ، وہ فوراً الجھنے لگتے :

’’ تم ہمارے کو کس لفڑے میں پھنسایا سالہ ۔ ادھر پکچر میں ڈبہ گول کیا ، آدھر ....‘‘

’’ بات کیا ہے سیٹھ ؟ حکیم جی کے پاس بھر گئے تھے؟‘‘

’’ گولی مارو سالہ حکیم کو ۔ او بھی ہم کو لوٹا ۔ تم سالہ سب چور ہے ۔‘‘

’’ دیکھو میاں لڑکی دو باتوں سے رام ہوتی ہے ۔ دونوں کا پٹرا ہو جائے تو ...‘‘

’’ تم کیا بولتا ؟ ہم کچھ نہیں سمجھا ۔‘‘

’’ صاف بات سننا چاہتے ہو تو بھئی لڑکی کو یا تو پیار دو کہ تمھارے لیے دیوانی ہو جائے یا کپڑا لتا ، زیور ۔‘‘

’’ پیار ہم تھوڑا کیا ؟ ‘‘ احمد بھائی کا گلا بھر آیا ۔

"مگر ادھر کئی مہینے سے تم نے ہاتھ دبا رکھا ہے۔ بیگم بڑی پریشان ہیں۔ سنا ہے رگوناتھ سے زیور پر روپیہ لے کر بچوں کو بھیجا۔ رگوناتھ کے چنگل سے زیور نکلنا آسان نہیں۔"

"سالہ تم ہم کو کیا سمجھتا ہے؟ ہم پیسہ دیوے اور چھوکری ہم کو لات مارے؟"

اتنے میں بیگم آ گئیں غسل خانے سے، فوراً احسان صاحب ہانکنے لگے:

"سی۔ پی۔ سی۔ آئی کے جواہر لال ستر دے رہا ہے۔ میں نے کہہ دیا لاکھ سے کم نہیں ہو گا۔ غرض پڑے پکچر لو ورنہ مجھے ڈسٹری بیوٹر کا توڑا نہیں۔ اصل میں خود اپنا ڈسٹری بیوشن آفس کھولنے کا ارادہ ہے۔ سورج مل سے میری بات ہو چکی ہے۔"

احمد بھائی کا خون کھول رہا تھا۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا، بیگم کو بھی معلوم تھا، احسان صاحب سونی‌صدی ہانک رہے ہیں۔ اس وقت ان کی جیب میں دو پیالی چائے کے پیسے مشکل سے نکلیں گے۔ لوکل ٹرین کا پاس بنوا لیا ہے، اسی کا رعب جھاڑتے پھرتے ہیں۔ بار بار جیب سے رومال کے ساتھ فرسٹ کلاس کا پاس نکل آتا ہے۔ ہر مہینے بڑی چال سے ری نیو کرا لیتے ہیں۔

''ارے بھئی ذرا پندرہ روپے دینا ، میرے پاس کی ڈیٹ نکلی جا رہی ہے ۔''

اتنی بڑی انڈسٹری ہے ، اور کوئی نہیں تو وہ غریب ایکسٹرا ہی پندرہ روپیہ دے مرتا ہے جسے یہ فلم میں رننگ رول دینے کا پکا وعدہ کر چکے ہیں ۔ اور بھئی کون جانے یہ پروڈیوسر کی ذات بڑی پراسرار ہوتی ہے ۔آج کوڑی کوڑی کو محتاج در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں ، کل کوئی اپنا بلیک کا پیسہ وھائیٹ کرنے والا مل جائے یا کسی ہیرو یا ہیروئن کو رحم آ جائے اور وہ گارنٹی دے دے — یہ پھر کھٹ سے کھڑے ہو جائیں ۔ جیسے نیم مردہ چوھیا کو گوبر سنگھاؤ تو جی اٹھتی ہے ، بالکل انہیں بھی کسی بھولے بھٹکے سہارے کی ضرورت ہے ۔ ویسے یہ کتنی بار مرے ہیں اور کتنی بار جی اٹھے ہیں ۔ اگر بیوی نہ بھاگتیں تو بے چارے یوں ننگے نہ ہو جاتے ۔

بیگم چائے کی پتی لینے پڑوس گئیں تو پھر احمد بھائی گرجے:

'' کیا بکواس لگائے ہو جی۔ ہم سب جانتا ۔ سورج مل سالہ ایک دم موالی ۔''

'' موالی ہے سیٹھ ، مگر دل کا چھوٹا نہیں ۔''

'' دیکھو ہم بول دیا — ہم ایک کوڑی کا دیوال نہیں۔ چھوکری ہمارے سے بات نہیں کرتا ۔''

احسان صاحب نے عجیب انداز سے قہقہہ لگایا کہ احمد بھائی کے پسینے چھوٹ گئے ۔

'' کیا سالہ تم پکا چار سو بیس ہے ۔ ہمارے کو ...''

بیگم پتی لے کر آ گئیں تو جلدی سے احسان بولے :

'' اچھا تو میں چلتا ہوں ۔ ذرا ابرار علوی کے ساتھ کہانی پر بیٹھنا ہے ۔'' عموماً وہ جو منہ میں آتا کہہ جاتے تھے ۔ انہیں یہ بھی یاد نہیں رہتا تھا کہ کل وہ بیدی کے ساتھ کہانی پر بیٹھ رہے تھے ۔ آج ذہن سے اتر گیا تو علوی کے ساتھ بیٹھ گئے ۔ بیگم جانتی تھیں سب کچھ ، مگر انہیں کیا ضرورت پڑی تھی کریدنے کی ۔ وہ حال ہی میں بار بار کہہ رہے تھے :

'' اپنی نیلوفر کیسی رہے گی ڈانسر کے رول میں ؟ ''

بیگم بھی سوچتی تھیں : لڑکی کو فلم میں کام مل جائے تو یہ دلدر دور ہوں ۔ انڈسٹری والوں نے تو انہیں جیسے پیشہ ور ہی سمجھ لیا تھا ۔ جب سے احمد بھائی نے ہاتھ کھینچا تھا ، سسک سسک کر دیتے تھے ، وہ اسٹوڈیو کے چکر لگانے لگی تھیں ۔

'' بیبی کو تو بس آپ کی فلم میں کام کرنے کا شوق ہے ۔ پیسے کی اسے بالکل پروا نہیں ۔ اس دن محبوب صاحب کا آدمی آیا تھا کہ بلایا ہے مرننگ رول ہے ۔ کہنے لگی :

'نہیں - وہاں کمُ کمُ ہے -' اے میں کہتی ہوں کمُ کمُ بھی کوئی ڈانسر ہے ؟ توبہ ! آپ نے بے بی کا ڈانس نہیں دیکھا - آپ تو کبھی آتے ہی نہیں - آئیے نا ہمارے ہاں ایک دن -''
بیگم اٹھلاتیں اور بے چارہ نیا پروڈیوسر پھول جاتا - حالانکہ وہ خوب سمجھتا تھا کہ بیگم سو فی صدی مسکہ مارتی ہے - اگر اس کی بیبی کو رول دے دیا تو دو تین دن کی شوٹنگ کے بعد ہی پیر نکالنے لگے گی - بے چارہ پروڈیوسر مفت کام کے رگڑے میں آ کر ادھر آدھر اس پر خرچ کرنے لگتا ہے - مفت کام کر رہی ہے ، چلو کیا حرج ہے اگر پانچ چھ لسی کے گلاس، آملیٹ اور توس ناشتے میں بیگم کے دوست کھا پی لیتے ہیں - کھانا وہ صرف کوالٹی سے مرغی آئے جب ہی کھا سکتی ہے - ساتھ تکڑ گدے تو ان لوگوں کے لگے ہی رہتے ہیں - مفت کام کر رہی ہے ، کپڑے بھی فلم میں اپنے ہی پہنے گی ، تو کیا ہؤا جو دو چار سو کے کپڑے بنوا دیے ؟

دو ساڑھیاں لکھنؤ کی چکن کی بیگم کو پسند آ گئیں - چلو دلوا دو ، دس پندرہ ہزار دینا پڑتے اگر اس جگہ کوئی دوسری ڈانسر ہوتی - یو - پی ، دلی والا کہتا تھا پدمنی کو لیجیے - آج ذرا نیلوفر کے گھر دعوت ہو جائے - دو چار بوتلوں کا ہی خرچہ ہے نا ! بزنس تو پھر پکی سمجھو -

کسی کو کیا معلوم کن کن راہوں سے گزرنا پڑتا ہے ان چھوٹے چھوٹے چھابڑی ڈھونے والوں کو ۔ انہیں جان بوجھ کر مکھی نگلنا پڑتی ہے ۔ مثلاً وہ جانتے ہیں کہ بیگم کے فیلے کے مفت کام کرنے والے اور بھی مہنگے پڑیں گے ۔ کیونکہ بیگم جو کچھ لیں گی اس کی رسید تو دیں گی نہیں ۔ اور جب کنٹی نیوٹی شروع ہو جائے گی پھر یہی بیگم ، جو آج دوڑ دوڑ کر آتی ہیں ، دو گھنٹہ بٹھائیں گی ، تب کہیں بات کرنے کو آئیں گی ۔

'' بیبی کا جی اچھا نہیں ۔ '' اور تب تک بیبی کا جی اچھا نہ ہو گا جب تک ہزار پانچ سو ان کے اوپر نہ چڑھائے جائیں گے ۔ چڑھاوا لے کر بھی وہ نخرہ کریں گی : '' مفت گیسٹ آرٹسٹ کے طور پر کام کر رہے ہیں ہم ۔''

مگر دوسرے پروڈیوسروں سے کہیں گی :

'' اے ہے پندرہ ہزار دیے ہیں ۔ میری بیبی تو ان روپوں کو جوتی کی نوک سے بھی نہیں چھوتی ۔ مگر کیا کروں ، پیچھے پڑگئے : بس یہ رول تو تمہارے سوا کوئی کر ہی نہیں سکتا ۔ پھر کرنا پڑا ۔ ورنہ بمل رائے تو اسے کشورکمار کے ساتھ لے رہے تھے ۔ میں نے کہہ دیا : مجھے کشور کمار بالکل نہیں بھاتا ۔ کیا بندر کی طرح اچھلتا ہے ...''

کتنی مزے کی بات ہے کہ جھوٹ ہانکنے والا جانتا

ہے سننے والے کو علم ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے ۔ پھر بھی یہ جھوٹ بیوپار کے ہتھکنڈے ہیں ۔ آدھی کامیابی تو اس آرٹ کی بدولت ہی مل جاتی ہے ۔

اس کے علاوہ اب لوگ یہ بھی جان گئے تھے کہ بیگم نیلوفر کے عاشقوں کو جلانے کے لیے اسے یوں مفت کام کرواتی ہیں ، تاکہ اگر احمد بھائی آئیں اور نیلوفر نہ ملنا چاہے تو وہ کہہ سکیں :

بھئی فلمستان کا پروڈکشن مینیجر آیا تھا ۔ شورلیٹ لے کر ۔ جالان سیٹھ کے ہاں پارٹی ہے ۔'' یا '' پرکاش کی کلر فلم کا آرٹ ڈائرکٹر آیا تھا ، کچھ ساڑھیاں خریدنا ہیں بیبی کی پسند کی ۔''

نیلوفر نے ایسی کئی فلموں میں کام شروع کیا ۔ احمد بھائی چت ہو گئے اور بیگم نے فوراً پروڈیوسر سے جھگڑا کر کے کام چھوڑ دیا ۔ جب تک احمد بھائی چالو تھے وہ مفت کا کام کیسے کرتیں ؛ گزر کہاں سے ہوتی ؟

مگر احمد بھائی کہاں تک چلتے ؟ ان کے سسر ریس میں پانچ لاکھ کھو بیٹھے ۔ ایک ہی دن میں برسوں کی کمائی چلی گئی ۔ ادھر احمد بھائی کو دیوالیہ قرار دینے والے بھی چوکنے ہو کر ٹوٹ پڑے ۔ کلابہ اور باندرہ کے جنرل اسٹور پر تالہ پڑ گیا ۔ نیلوفر والے فلیٹ پر بھی ٹانچ آ گئی ۔

بیگم کے چھکے چھوٹ گئے ۔ بچے بھی گرمیوں کی پندرہ دن کی چھٹیوں میں آئے ہوئے تھے ۔ انہیں واپس بھجوانے کا سوال ہی نہیں رہ گیا تھا ۔ صفِ ماتم بچھ گئی ۔ اور اس وقت، جب قیامت کا منظر تھا ، نیلوفر ہنس رہی تھی ۔ چاکولیٹ منہ میں ڈال کر ، پنی کی چھوٹی سی ٹوپی انگلی پہ چڑھائے ، اپنے ڈریسنگ گاؤن کی بیلٹ کا لبادہ اڑھائے ، گڑیا بنا کر کھیل رہی تھی ۔

جب پلش کا فرنیچر گھسیٹا جانے لگا تو بیگم نے جھٹ سے زیور کی پوٹلی ساڑھی کے پلو میں باندھ کر اندر پیٹی کوٹ میں لٹکا دی اور نیلوفر کو کوسنے لگیں ۔ خدا کا کرنا کیا ہؤا کہ پچھم کی اوٹ سے دروازہ کھلا ، احسان صاحب مع سورج مل کے غیب سے ظاہر ہوئے ۔

دیکھتے دیکھتے فلیٹ کی قیمت مع فرنیچر وغیرہ کے ادا کر دی ۔ کاغذات بیگم کی گود میں ڈال دیے اور نیلوفر کی اَس سڈول پنڈلی کی طرف بھی نہ دیکھا جو نیلے ڈریسنگ گاؤن سے بادلوں میں بجلی کی طرح کوند رہی تھی ۔

سورج مل کنوڈیا نو دولتیے نہیں تھے ۔ ان کے دادا کے دادا کی آٹے دال کی دکانیں کلکتہ میں پھیلی ہوئی تھیں ۔ چاولوں میں سفید کنکر ملانے کا فن شاید انہی نے ایجاد کیا تھا ۔ دال میں بڑے کنکر ملانے میں کئی فائدے

ہیں : ایک تو چننے والی گرہستن کی آنکھیں نہیں پھوٹتیں ، دوسرے ان کے ملے رہ جانے کا بھی خطرہ نہیں ۔ چندھوں کو بھی نظر آ جاتے ہیں ۔ آٹے میں سفید لکڑی کا برادہ ملا دینے سے کسی پر مصیبت نہیں آتی ۔ لکڑی بھی ایک قسم کی ترکاری ہے ۔ وہ یہ برادہ خاص طور پر جاپان سے امپورٹ کیا کرتے تھے ۔ شدھ گھی میں اگر سیر پیچھے چھٹانک چربی ملا دی جائے تو بھی کسی کو نقصان نہیں پہنچتا ۔ چربی بھی جانور کی چکنائی ہے ۔ برابر فائدہ مند ہے ۔ ہلدی میں کیسو کے پھول اگر پیس کر ملا دیے جائیں تو فائدہ ہی ہے ، گرمی کم ہو جاتی ہے ۔ دھنیے کی گری نکال کر اگر بھوسا پسوا کر الگ بیچا جائے یا الائچیوں میں سے تھوڑا سا ست نکال لیا جائے تو کوئی ٹوٹا نہیں آتا ۔ ویسے بڑے سادھو منش تھے ۔ کتنے ہی آشرم ان کے دان پر چلتے تھے ۔

سورج مسل گریجویٹ تھے ۔ فیشن ایبل تھے ۔ ان کی بیوی ایف ۔ اے پاس ، ناچ گانے میں طاق ، بڑی حسین عورت تھیں ۔ چار بچے تھے ۔ بڑے پیار کی زندگی تھی ۔ مگر منہ کا مزہ بدلنے کے لیے وہ دو چار لڑکیاں رکھا کرتے تھے ۔ بزنس میں بڑی سہولت رہتی ہے ۔ یار دوستوں کو گھر میں شراب پلانا انہیں قطعی پسند نہ تھا ۔ خاص طور جب سے

پروہبشن شروع ہؤا تھا ۔ اصل ہو حق تو وہ ان لڑکیوں کے ساتھ ہی کرسکتے تھے ۔ نیلوفر عرصے سے ان کے پلان میں تھی ۔ وہ اسے بہت اونچے اور ٹھاٹ دار طریقے پر رکھنا چاہتے تھے ۔ احمد بھائی لیجڑ انسان تھا ، ہر بات مسک کر کیا کرتا تھا ۔

سورج مل کچھ روپیہ فلموں میں لگانا چاہتے تھے ، مگر جن شرائط پر وہ روپیہ لگانا چاہتے تھے ، بڑے پروڈیوسر تیار نہ ہوتے ۔ساٹھ فی صدی سالانہ سود کون دے سکتا تھا ؟ اتنا سود دو ، آرٹسٹوں کی بلیک بھرو ، میوزک ڈائرکٹر بھی بلیک ہی زیادہ مانگتے ہیں ۔ دس لاکھ کی فلم بناؤ : دو لاکھ سود کے ، چار لاکھ بلیک کے ، رہ گیے چار لاکھ ، تو اس میں سے ساری فلم بنائی جائے ۔ چار لاکھ کی فلم کو دس لاکھ کی ظاہر کرنا وہ فن ہے جو ٹکے والے پروڈیوسر ہی جانتے ہیں ۔

احسان صاحب بھی اسی قسم ایک کے پروڈیوسر تھے ، جنہیں پا کر سورج مل کنوڈیا کو یقین ہو گیا کہ اب محبوب ، شانتا رام اور بمل رائے کا زمانہ ختم ، ایس مکرجی کا راج ختم ، اب تو بس سورج مل فلم پروڈکشن کا ہی بول بالا ہوگا ۔ انہیں دادر کا فلیٹ قطعی نا پسند تھا ۔ اس لیے انہوں نے اے روڈ ، چرچ گیٹ پر اونر شپ پر فلیٹ لے

آکر سارے خاندان کو اس میں انڈیل دیا ۔ ایک موٹر میں آنہیں سکتے تھے ، اس لیے ایک موٹر ڈرائیور چلا کر لایا ۔ جاتے وقت وہ ایک گاڑی چھوڑ گئے ، صبح ایک ڈرائیور بھجوا دیا ۔

مگر سورج مل دوسری قسم کے انسان تھے ۔ انہیں نیلوفر کی سستی اداؤں سے سخت کوفت ہوتی تھی ۔ ابھی تک آسے ہاتھ لگانے کی بھی خواہش نہیں ہوئی تھی ۔ وہ آسے ڈھیل دینا چاہتے تھے ۔ کبھی کبھار گال پر چٹکی لے لیتے ، کبھی کولھے پر دھپ مار دیتے ۔ اس سے بلند مرتبہ ابھی آسے دینے کو تیار نہیں تھے ۔ وہ تھی بھی ذرا گنوار ۔ احمد بھائی کی صحبت میں بہت ہی بھونڈ پن آ گیا تھا ۔ ایک دم بمبئی کی گلیھاری زبان پر اتر آتی ۔ موالیوں کی طرح اکڑ کر دیکھتی ، گویا کہہ رہی ہو: '' یوں نہ مانو گے ۔ پھر ہو جاؤں ننگی ؟ ''

مگر سورج مل آس کی برہنگی سے قطعی مسحور نہ ہوئے ۔ کم از کم ظاہر نہ ہونے دیا ۔ آس کی اصل بات جو آنہیں پسند تھی ، وہ آس کا شریف خون تھا ۔ وہ سارے ہندوستان کی تہذیب کا لطف آٹھا چکے تھے ۔ آنہیں عورت میں بڑے گنوں کی تلاش تھی ، جو آنہیں دلی ، آگرہ اور بنارس کے آونچے کوٹھوں میں ملے تھے ۔ بڑی خوبصورت آردو بولتے تھے ۔ بمبئی

کی بولی پر کبیدہ خاطر ہو جایا کرتے تھے ۔

نیلوفر کو پہلے تو اُن سے گھن آئی ، پھر ٹھیک لگنے لگے ، اور پھر اچھے لگنے لگے ۔ وہ اُنہیں لبھانے کے لیے ایک دم شرافت پر اُتر آئی ۔ سلیقے سے کپڑے پہننے لگی ۔ ڈریسنگ گاؤن میں اُسے دیکھ کر وہ گھبرا کر دو چار بار لوٹ گئے تو وہ اُن کے آنے سے پہلے کپڑے پہن کر تیار بیٹھنے لگی ۔

وہ اُسے آزادی سے ساتھ لے جانے لگے ۔ ذرا شوقین لوگوں کی دعوتوں میں ، پکنکوں اورگانے بجانے کے پروگراموں میں ۔ کلبوں میں بھی وہ ساتھ رہنے لگی ۔ گو اُسے معلوم تھا: اُس کی طرح تین اور لڑکیاں ہیں ، جن سے سیٹھ کی اولاد بھی ہے ، مگر وہ سب نہایت شرافت سے رہتی ہیں ۔ اُن کے بچے انگریزی اسکولوں میں جاتے ہیں ۔ جس محلے میں رہتی ہیں سیٹھ کی بیوی سمجھی جاتی ہیں ۔ سیٹھ ہنگامے کے قائل نہیں ۔ چپ چاپ آتے ہیں ، اٹھتے بیٹھتے ہیں ، چلے جاتے ہیں ۔ یار دوست بھی آتے ہیں ۔ مصلحت دیکھتے ہیں تو کسی دوست کو داشتہ ادھار بھی دے دیتے ہیں ۔ اگر دوست چاہے تو بالکل بھی دست بردار ہو جاتے ہیں ۔ مع خاندان کے فلیٹ اس کے ہاتھ بیچ بھی دیتے ہیں ۔

سوال یہ اٹھتا ہے کہ اتنے خاندانوں کا خرچ کیوں کر برداشت کرتے ہیں ؟ بڑی لمبی چوڑی بیوپاری تفصیل ہے ۔

خیر جہاں اتنی تفصیل جھیلی ہے، یہ بھی برداشت کر لیجیے، شاید کوئی کام کا نکتہ ہاتھ آجائے۔

سیٹھ ان لڑکیوں کے نام سے بزنس کرتے ہیں۔ ان میں اتنی عقل تو ہے نہیں کہ کچھ سمجھیں یا شبہ کریں۔ وہ جن کاغذات پر دستخط لیتے ہیں، یہ کر دیتی ہیں اور انہیں معلوم بھی نہیں ہوتا کہ وہ لاکھوں کا لین دین کر رہی ہیں۔ ان کے نام سے ٹھیکے لیتے ہیں، مگر سب قانونی حدوں کے اندر۔ جتنا اس طریقے سے انکم ٹیکس، سپر ٹیکس سے بچ جاتا ہے، وہ ان کے خرچ سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔

نیلوفر چونکہ پڑھی لکھی تھی، اسے معلوم ہوگیا کہ احسان صاحب کو جو فلم کے لیے روپیہ دے رہے ہیں وہ اس کی طرف سے ہے۔ وہ کمپنی کی مالک ہے۔ اگر اس کے دل میں بے ایمانی آجائے تو سیٹھ منہ دیکھتے رہ جائیں۔

اپنی طاقت کا اندازہ کر کے وہ ایک دل پھول گئی۔ بیگم کو اس نے سمجھایا تو ان کی بھی باچھیں کھل گئیں۔ خیر بیچ میں جھگڑا کرنے سے کیا فائدہ؟ نیک آدمی ہے۔ اپنا بھی تو فائدہ ہی ہے۔ کسی بات کی کمی نہیں۔ بیگم سمجھ دار تھیں۔

نیلوفر کو انہوں نے آہستہ آہستہ رانی صاحبہ کہلوانا شروع کر دیا۔ سیٹھ مسکرا کر رہ گئے۔ ان کی سب ہی

عورتیں اپنے اپنے محلوں میں رانیاں بنی ہوئی تھیں ، مگر ایک دوسری سے واقفیت نہ تھی اور صرف اپنے ہی کو رانی سمجھتی تھیں ۔

جب خیر سے نیلوفر کا پیر بھاری ہؤا تو سیٹھ ایسے خوش ہوئے جیسے ہیجڑے کے گھر بیٹا ہونے کی خبر ملی ہو ۔ خود لے کر ڈاکٹر کے پاس گئے ۔ اپنے ہاتھوں سے ٹانک اور وٹامن کھلاتے ۔ ہر وقت احتیاط رکھنے کو کہتے ۔

مگر جس دن فلم کی مہورت ہوئی تو سیٹھ نے پوجا کرتے وقت صرف اپنی بیوی کو ساتھ بٹھایا ۔ نیلوفر کا جی اچھا نہ تھا ، مگر وہ ضد کر کے گئی اور جب وہ پوجا کر رہے تھے تو ساتھ بیٹھنے پر اڑ گئی ۔

'' واہ ! میں اصل پروڈیوسر ہوں ، میرے ساتھ مہورت ہوگی ۔''

'' پیسہ تو سیٹھ کا ہے ۔ ان کی خوشی ہو جانے دو ۔'' احسان صاحب نے سمجھایا ۔

'' اے ایسا بھی کیا چھچھور پن ۔'' بیگم نے بھی ڈانٹا ۔

تصویر کھچنے لگی تو وہ بھی ساتھ ڈٹ گئی ، مگر عین وقت پر اس کے اور سیٹھ کے درمیان احسان صاحب گھس آئے ۔ وہ ہر کھنچتی ہوئی تصویر میں گھستی ، مگر ذرا سی

ترتیب بدل کر پھر کونے میں جا پڑتی ۔

جب تصویریں اخبار میں چھپیں تو اس کا نام بھی یونہی کہیں روا روی میں اور ایکسٹرا لڑکیوں کے ساتھ آ گیا ۔ حسبِ عادت اس نے دوسرے دن سیٹھ سے الجھنے کی کوشش کی تو انہوں نے پہلے تو ہاتھ سے اسے ایک خوراک ٹانک کی پلائی ، پھر بڑی نرمی سے سمجھایا : ” یہ سب بزنس کی باتیں ہیں ۔ بے کار عورتوں کو ٹانگ نہیں پھنسانا چاہیے ۔ آہستہ آہستہ سمجھ جاؤگی تو پھر ایسی فضول باتیں نہیں کرو گی ۔“

مگر نیلوفر رانی بن چکی تھی ۔ اسے چین نہ پڑتا ۔ خواہ کتنی بھی تکلیف ہوتی ، وہ شوٹنگ پر جاتی ۔ ہر بات میں بال کی کھال نکالتی :

” یہ اتنا وقت کیوں خراب ہوتا ہے ؟ “

” پروڈکشن مینیجر چور ہے ۔“

” یہ گانا چلتا ہؤا نہیں ہے ۔“

” یہ ہیروئن بلیک کیوں لیتی ہے ؟ ہیرو دو بجے کیوں آتا ہے ؟ سب کام چور ہیں ۔“

بیگم بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتیں ۔ دونوں مل کر ہر ایک سے الجھتیں ۔ لوگ منہ پر تو کچھ نہ کہتے ، پیٹھ پیچھے گالیاں دیتے ۔

جب نیلوفر نے بھونڈی سی لونڈیا جنی تو سیٹھ کا منہ سوکھ گیا - انہیں اس بات پر فخر تھا کہ ان کی سب داشتاؤں کے پہلوٹھی کے بیٹے ہی ہوئے تھے - ان کی اصلی بیوی کے بھی تین لڑکے ہی تھے - صرف ایک لڑکی تھی، جس کے لیے وہ چند لاکھ میں آسانی سے بر خرید سکتے تھے، حالانکہ وہ تو نیلوفر کی لڑکی سے بھی زیادہ بدصورت تھی -

لڑکی کی پیدائش پر کچھ بیزار سے ہو گئے - مشغولیت بھی بڑھ گئی - اڑتی اڑتی یہ بھی خبر ملی کہ پنجاب سے کوئی بڑی دھار دار لڑکی آئی ہے ، سیٹھ آج کل اس کے ساتھ بہت گھومتے ہیں - اس نے سیٹھ سے لڑنے کی کوشش کی تو وہ ہنس کر ٹال گئے :

" ارے بھئی بے چاری کام کی تلاش میں ہے - احسان میاں سے میں نے کہا کوئی چھوٹا سا رول ہو تو اسے دے دو -"

" پکچر ختم ہو گئی ، اب رول کہاں دھرے ہیں ؟" بیگم بولیں -

" وہ ایک کیفے میں ڈانس رہ گیا تھا -" احسان بولے -

" آپ تو کہہ رہے تھے اب کچھ باقی نہیں -"

" ڈسٹری بیوٹر نے کہا ہے ایک اور ڈانس ڈالو -"

" ارے تم سمجھتی تو ہو نہیں ، بے کار لڑنے لگی،

ہو۔'' احسان صاحب نے خلاف عادت ذرا گرمی سے کہا۔
'' اور آپ بہت سمجھتے ہیں ؟ چپکے بیٹھے رہیے ۔ میرا منہ نہ کھلوائیے ۔ رنڈیوں کی دلالی کرتے ہیں اور اوپر سے اکڑ دکھاتے ہیں ۔''
'' جانے دو ان باتوں سے کیا فائدہ ؟'' سیٹھ نرمی سے بولے ۔
'' کیوں جانے دوں ؟''
'' احسان میاں آپ ہی چپ ہو جائیے ۔''
'' میں تو چپ ہوں سیٹھ جی ۔ ان کتیوں کے منہ آنا اپنی عزت گنوانا ہے ۔''
'' کتیا ہوں گی آپ کی امی جان ۔'' نیلوفر آپے سے باہر ہوگئی ۔ وہی نیلوفر، جس کی سوا چار سال کی عمر میں بسم‌الله ہوئی تھی ۔ جو تتلا کر گایا کرتی تھی : '' لب پہ آتی ہے دعا ...'' تو دادی بی اس پر سے صدقہ آتارا کرتی تھیں ۔ جسے ساتوں کلمے ازبر تھے ۔ جو سلام پڑھتی تھی تو لوگوں کی آنکھیں بھیگ جاتی تھیں ۔ وہی اب کھلی کھلی گالیاں دینے میں مچھلی والیوں کو بھی مات کر رہی تھی ۔
احسان صاحب بھی کچھ کم نہیں تھے ۔ ان کی گالیوں میں پھیلاؤ تھا اور گہرائی تھی ۔ مگر سیٹھ بیٹھے مسکرا رہے

تھے ۔ وہ اس وقت تک مسکراتے رہے جب آوبچی ایڑی کی سینڈل لے کر نیلوفر نے احسان صاحب کی نکسیر چھڑا دی ۔ وہ تو اسی وقت پولیس چوکی جانے کی دھمکی دے رہے تھے ، سیٹھ نے سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا ۔ اس واقعہ کے بعد کئی دن تک سیٹھ نہیں آئے ۔ نیلوفر نے کتنی بار فون کیا ، معلوم ہؤا نہیں ہیں ، یا سو رہے ہیں ۔ بہت پیچھے پڑی تو ٹیلی فون رکھ دیا گیا ۔ مگر روپے پیسے کی کوئی تکلیف نہ ہوئی ۔ مہینے کا خرچ آسی طرح اٹھائیس تاریخ کو چیک کی صورت میں مل گیا ۔ آج پہلی بار رسید پر دستخط کرتے وقت نیلوفر نے دیکھا کہ رسید پر روپیہ کی وصولی کا حوالہ ہے ۔ آج تک جتنا روپیہ اسے ملا تھا ، سب ایسے ہی ملا تھا ۔ اگر سیٹھ چاہیں تو یہ روپیہ واپس لے سکتے ہیں ۔ یہ روپیہ اس نے فلم بنانے کے لیے لیا تھا ۔ اس کے علاوہ بھی وہ نہ جانے کتنی رسیدیں اسی طرح وقتاً فوقتاً دیتی رہی تھی ۔ کچھ سادی ہنڈیاں بھی دستخط کر کے دی تھیں ۔ مکان بے شک اس کے نام تھا ۔ اس کے علاوہ لاکھ ڈیڑھ لاکھ سے کم کا زیور نہ ہوگا ۔ بیگم بدحواس ہو گئیں ۔ کمبخت نے بے کار بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا ۔

نیلوفر نے رسید پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا ۔ سیٹھ نے کچھ نہ کہا ، مگر چوتھے روز چیک واپس آ گیا ۔

اے روڈ کی پرشور فضا میں کسی نے وہ کوسنے گالیاں نہیں سنیں جو نیلوفر اور بیگم کی جنگ کے دوران میں دی اور لی گئیں ۔ نہ ھی آن جوتیوں کی پھٹاپھٹ سنائی دی جو ایک دوسرے کے سر پر ماری گئیں ۔ اور نہ ھی کسی کے کان پر جوں رینگی، جب رو دھو کر دونوں پھر گلے مل گئیں ۔

بیگم نے سیدھے جا کر احسان کے پیر تھام لیے ۔ وہ بھی کچھ پریشان سے بیٹھے تھے، من گئے ۔ پھر دونوں سیٹھ کے پاس گئے ۔ گھر پر بزنس کے سلسلے میں کبھی کسی سے نہیں ملتے، دفتر میں کئی گھنٹے انتظار کرنے کے بعد سیٹھ ملے ۔ بالکل ڈیرےدار طوائفوں کی نائیکاؤں کی طرح انہوں نے سیٹھ کو یقین دلایا کہ ان کے فراق میں نیلوفر لب دم ھو رھی ھے ۔ رو رو کر بے حال ھوگئی ھے ۔ اگر وہ نہیں آئے تو جان دے دے گی ۔

سیٹھ بھی واقعی شری کھنڈ کے بنے ہوئے تھے، فوراً بڑے پیار سے بولے :

" فرصت نہیں ملی ۔ پکچر کی ڈلوری دینا ھے ۔ پوچھ لیجیے میاں سے، دم لینے کا وار نہیں ۔ کمبخت مدراس والا بہت تنگ کر رھا ھے ۔ کہتا ھے اتنی لیٹ کر دی پکچر ۔"

اور وہ کاروباری مشکلات کی تفصیلوں میں چلے گئے ۔

اتنے میں وہی پنجاب کی نوخیز کلی لجائی شرمائی آ گئی ۔ آج پریمیر پر جانا تھا کسی فلم کے ۔ نیلوفر کتنے دن سے تڑپ رہی تھی اس فلم کے پریمیر پر جانے کے لیے ۔ نئی ساڑھی بھی خریدی تھی ۔ سیٹھ ایک دم اُٹھ کر اُس کے ساتھ اندر کے کمرے میں گئے ۔ بیگم بیٹھی سوکھتی رہیں ۔ معلوم ہؤا وہ تو ادھر ھی سے نکل گئے ۔

'' میں نہ کہتا تھا سیٹھ ایک حرامی ھے ۔ ایک دفعہ کسی بات کا فیصلہ کر لے تو پھر کوئی چیز اسے بدل نہیں سکتی ۔ اب نیلوفر میں وہ دم خم بھی نہیں رہا ۔''

'' کیا مطلب ؟ '' بیگم بن کر چونکیں ۔ انہیں کیا نیلوفر کو بھی یہی دھڑکا لگا ہؤا تھا ۔ سیٹھ سورج مل، احمد بھائی کی طرح کبھی اُس پر لوٹ نہیں ہوئے ۔ پھر بھی دو سال نبھا گئے ۔

اگر نیلوفر اتنی اکھّڑ نہ ہوتی تو ساری عمر نبھا جاتے ۔ انہوں نے کبھی کسی کو منجھدار میں نہیں چھوڑا ، مگر رسید پر دستخط نہ کر کے اس نے ان کا سخت اپمان کیا ۔ اور یہ وہ نہیں برداشت کر سکتے کہ اُن کی نیت پر کوئی شک کرے ۔ نیلوفر کو انہوں نے خود ھی معاف کر دیا ۔ وہ تو احسان صاحب کی صورت دیکھ کر اندر چلی گئی تھی ۔ اس کا خون کھول رہا تھا ۔ اسے ساری دنیا پر غصہ آرہا تھا ،

جو اس نے ننھی سی بچی پر اتارا :

'' اس کمبخت کو بھی وہیں پھنکوا دو ۔''

''اُنہہ! نہ جانے کیا ارادہ ہے اس کا؟'' احسان صاحب چڑ گئے ۔

'' کیوں ؟ میں کیوں پالوں اس حرامزادی کو ؟''

'' دیوانی نہ بنو ۔''

'' ارے میں تو ان کے جھکیے چھڑا دوں گی۔ بنیے کا بچہ سمجھتا کیا ہے ؟''

'' نیلوفر بی بی — ہاتھی سے گنے چھیننے چلی ہو ۔ کیا سمجھا ہے تم نے ؟ سیٹھ کوئی نرا گاؤدی ہے ؟ نہ جانے کس گمان میں ہو تم ۔''

'' مگر لڑکی سیٹھ کی ہے کہ نہیں ۔ اس کا حق ہے یا نہیں ؟ '' بیگم بولیں ۔

'' لڑکی سیٹھ کی ہو یا نہ ہو ، اس سے بحث نہیں ، مگر اس کا حق کچھ نہیں ، کیونکہ قانوناً وہ ان کی نہیں۔ سیٹھ کا ایسا کوئی بچہ بھی ان کی دولت میں حق دار نہیں ۔''

'' کیا مطلب ؟ ''

'' مطلب یہ کہ تم گدھی ہو نری ۔ ہسپتال میں تم کس نام سے گئی تھیں ۔''

''ہسپتال میں؟ پتہ نہیں ۔ لیکن بل سارے سیٹھ جی نے

چکائے ۔''

'' ھاں ، مگر بچے کے باپ کا نام ؟ ''

'' سیٹھ جی کا ھوگا — اور کس کا ھو سکتا ھے ؟''

'' جی نہیں ، یہی توتمھاری بھول ھے ۔''

'' پھر کس کا نام تھا ؟''

'' اب جانے دو ، کیا حاصل ان باتوں سے ؟ ''

'' آخر بتاتے کیوں نہیں ؟ ''

''بھئی تم سے ڈر لگتا ھے ۔ تمھارے ھاتھ پیر قابو میں ، نہ زبان قابو میں ۔''

'' نہیں ایسی بھی کیا بات ھے ، بتاؤ نا ۔''

'' میرا ھی نام ھے ۔''

'' تمھارا ۔ اے کچھ گھاس تو نہیں کھا گئے ؟''

'' اچھا تم ھی بتاؤ کیا کرتا ؟ نہ کر دیتا ۔ دیکھو نیلوفر اس مارا ماری سے کچھ حاصل نہ ھوگا ۔'' انہوں نے اس کی آنکھوں میں خون اترتا دیکھ کر کہا ، '' ٹھنڈے دل سے بات سنو ، ورنہ بھئی میں چلا ۔'' انہوں نے دھمکی دی ۔

گالیوں کوسنوں کی معقول مقدار کے تبادلے کے بعد بولے :

''حق کی بات پوچھتی ھوتو قانوناً تم میری بیوی ھو ۔''

احسان صاحب نے بتایا ، '' سیٹھ شروع سے اس لفڑے میں پڑتے ھوئے ڈرتے تھے ۔ اس شرط پر تمھیں یہاں لائے تھے

کہ میں نکاح کر لوں اور ...''

'' اوئی! مردوئے بھیجا لوٹ گیا ہے تیرا ۔ نکاح کیسے ہو گیا ؟ یک طرفہ نکاح ہو گیا ؟ ''

'' باقاعدہ نکاح ہؤا ہے ۔ نکاح نامہ موجود ہے ۔''

'' ہیں ۔ نکاح نامہ ۔ وہ کیسے ؟ '' انھوں نے نیلوفر کا ھاتھ پکڑ لیا ، جو احسان صاحب پر گالیاں برسانے برسانے جوتوں پر اتر آئی تھی ۔

'' جعلی نکاح نامہ ۔ میاں جی جیل کی ہوا کھانے کا ارادہ ہے ؟''

'' بیگم اتنی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوں ۔ اور بخدا میری نیت میں کھوٹ ہو تو سؤر کا سا منہ ہو ۔''

'' اب سؤر سے کیا کم ہے ۔ '' نیلوفر جلے پھپولے پھوڑنے لگی ۔

'' تمھیں تو میرا شکر گزار ہونا چاھیے کہ یہ لونڈیا بھی حرامی نہیں اور سیٹھ بھی خوش ۔ قسم سے میں نے تو یہ سب کچھ اس وجہ سے کیا کہ بھئی آخر کو شریف لڑکی ہے ، اولاد ہوگی تو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی ۔''

بیگم کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رھا تھا ۔ سخت جان ہو جانے کی وجہ سے متحیر نہ ہونے کی کچھ عادت پڑ چلی تھی ، پھر بھی پوچھا :

" مگر یہ مؤا نکاح ہؤا کیسے ؟ "

" اب کیسے بھی ہؤا ، دستخط موجود ہیں ۔"

" اے ہے کیسے دستخط ؟"

" صاحبزادی کے ، پھر دو گواہوں کے ۔"

" نہ جانے کس دھوکے سے لے لیے دستخط ۔ ابھی تو اللہ جانے اور کاہے پہ دستخط نکلیں گے ۔ یہ فلیٹ تو ہے ، یا یہ بھی دستخطوں میں گیا؟ کتنی بار کہا : نیک بخت پڑھی لکھی ہے ، دیکھ تو لیا کر ۔ بس آنکھ بند کی اور اپنی میت پہ دستخط کر دیے ۔ "

" ہاں یہ فلیٹ ابھی تک تو تمہارا ہی ہے ، آگے سیٹھ کی مرضی ۔ اگر نیلوفر ذرا ٹھنڈے دل سے سوچ سمجھ کر ..."

" اب کیا ہوگا ؟ " بیگم حسرت سے ہاتھ ملنے لگیں ۔

" ہوں ۔ تو آپ ہمارے خصم ہوئے ؟" نیلوفر نے زور کا قہقہہ لگایا ۔

" اے نیلوفر یہ کیا بدتمیزی ہے ؟" بیگم جل گئیں ۔ شاید اب بھی گزشتہ تعلقات کے واسطے انہیں تھوڑا سا خیال تھا ۔

" ارے واہ! ہم تو اپنے میاں سے بات کر رہے ہیں ۔"

" بس بس ۔ زیادہ بکواس لگائی تو جوتی سے منہ مسل

دوں گی ۔

'' مہر کتنا ہے میاں جی ؟'' نیلوفر مسکرائی ۔

'' وہی شرعی مہر مبلغ بتیس روپے ۔''

'' نقد ۔ '' نیلوفر نے ایک اور قہقہہ لڑھکایا ۔ اے روڈ پر رہنے والے زندہ دل لوگوں نے سوچا بڑی ہنس مکھ ہے یہ قہقہوں کی رانی ! نیچے مندر میں بھجن شروع ہو گئے تھے ۔ سامگری کی بوباس ہوا کو بدمست بنا رہی تھی ۔ ہارمونیم کی پیں پیں ڈھولک کی گمک اور مجیروں کے چھناکوں کے ساتھ مل کر ماحول کو جان دار بنائے ہوئے تھی ۔ پجاری جی اپنی پھٹے بانس جیسی بے سری آواز میں کوئی فلمی گیت گا رہے تھے :

'' دیوتا مجھ کو تیرا سہارا ۔ میں نے تھاما ہے دامن تمہارا ۔'' یا شاید: ''تو نے تھاما ہے دامن ہمارا ۔'' ہمارا ؟ تمہارا ؟ فلمی ٹیون میں جو بیٹھ جائے وہی ٹھیک ہے ۔ یہاں کسی کو پتہ نہیں کیا ہمارا ہے اور کیا تمہارا ۔ خدا نے انسان کا دامن پکڑا ہے یا خدا کا دامن انسان نے پکڑ رکھا ہے ۔ کچھ فرق نہیں پڑتا ۔ جس انداز سے پجاری گا رہا ہے ، اس سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان اور خدا دست بہ گریباں ہیں ۔ اور بس ۔ اور نیلوفر اونچے اونچے قہقہے فضا میں اچھال رہی ہے ۔ کیا بھگوان کی لیلا ہے ۔ اس کی

ماں کا یار اس کا قانونی شوہر ! قانون اور شوہر ، شوہر اور قانون — سب ایک سڑک کے پتھر ہیں ، جن سے نیلوفر جیسی بے بس لڑکیوں کو سر پھوڑنا پڑتا ہے ۔ تب ہی تو آس کے قہقہوں میں شعلے بھڑک رہے ہیں ۔ اور دور جو ہو کی خواب آلود فضا میں پنجاب کی ایک نوخیز کلی ہولے ہولے پھول بن رہی ہے ۔ سیٹھ کی آنکھوں سے ہوس کی چنگاریاں چٹخ رہی ہیں ۔ کل شگوفہ کے پہلے فلم کی مہورت ہے ۔ وہی ہیروئن ہے ۔ وہی اپنا پیسہ لگا رہی ہے ۔ اپنا پیسہ — سیٹھ کا پیسہ — اپنا جسم — اور سیٹھ کا جسم !

یہی پیار ہے — اور یہی بیوپار !

چوتھا باب

''مگر یہ اللہ مارا نکاح ہوا کب ؟ کہاں ہوا ؟''

'' لکھیم پور میں ۔ اس فلیٹ میں آنے سے پہلے ۔''

'' میاں ہوش کے ناخن لیو ۔ ہتھ کڑیاں نہ پڑوا دوں تو بیگم نہیں مالزادی بولنا ۔''

'' ہاں مقدمہ لڑو تو شاید جیت جاؤ ۔ مگر کیا ضرورت ہے مقدمے کی ؟ چاہو تو آج طلاق لے لو ۔ میں نے تو تمہارے ہی بھلے کو کیا تھا ۔''

'' ایسی کی تیسی میرے بھلے کی ۔''

'' ہاں جی طلاق دے دو ۔''

'' سوچ لو ٹھنڈے دل سے ۔'' احسان صاحب مسکرائے ۔

'' کیا سوچ لوں ؟''

'' ممکن ہے سیٹھ پھر من جائیں ۔ ویسے وہ کبھی تھوک کر چاٹا تو نہیں کرتے ۔ بھئی میں تو اپنی سی کر چکا ۔ اب اس سے زیادہ کیا کر سکتا ہوں ۔ مگر فکر نہ کرو ، بچوں کی فیس ہر مہینے وقت پر پہنچ جائے گی ، گھر کا خرچ بھی ملتا رہے گا ۔''

''مگر وہ آئے کیوں نہیں ؟ تم نے کہا ہوتا نیلوفر انہیں

بہت یاد کرتی ہے ۔'' نیلوفر کی آواز بھرا گئی ۔ احسان صاحب ہنس پڑے ۔

'' کیا بچوں جیسی باتیں کرتی ہو ۔ موجی آدمی ہے اپنا سیٹھ ۔ کسی سے دل لگ جائے تو کیا کہنے ، مگر ایک دفعہ منہ پھیر لیں تو پھر ...''

''اے توبہ جی — لڑکی سے ایسا کون سا گناہ ہوگیا ۔'' بیگم بولیں ۔

'' دل کا سودا جو ہؤا ۔''

'' ہنہ — حرامزادہ بڑا آیا دل والا ۔'' نیلوفر غرائی ۔

'' میں کہتا ہوں اس بکواس سے فائدہ ؟ سانپ نکل گیا ، تم بیٹھی لکیر پیٹ رہی ہو ۔''

'' ایسے سانپ کی منڈی نہ مسل دیوں تو نیلوفر نہیں چھنال بولنا ۔''

'' کیوں بے کار میں جی کڑھا رہی ہو ۔'' احسان نے اس کا ہاتھ دبایا ۔

'' اُنہہ — غارت ہو ۔'' نیلوفر نے ان کا ہاتھ دور جھٹکا ۔

'' بھئی واہ — یعنی ہم ہاتھ بھی نہ لگائیں ۔''

'' نہیں ۔''

'' وہ کیوں جی ؟ ''

'' ہمیں گھن آتی ہے ۔''

’’ اللہ رے دماغ ! رسی جل گئی پر بل نہ گیا ۔ اب یہ نخرے نہیں چلیں گے مس صاحب ۔ وہ دن گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے ۔ دس برس ہو گئے نا اس دھندے میں ۔‘‘

’’ تو پھر ؟‘‘

’’ تیس پر عورت ڈھل جاتی ہے ۔‘‘ وہ بڑھے چلے گئے ۔

’’ اے کاھے کو طوفان جوڑتے ہو جی ۔ کون ہے تیس کی ؟‘‘ بیگم بیچ میں آ گئیں ۔ ’’چل لڑکی اپنے کمرے میں جا ۔ یہ مؤا تو آج واہی تباہی پر تلا ہؤا ہے ۔‘‘

’’ میں ڈھل گئی ہوں ۔ یہی کہہ رہا ہے نا ؟‘‘ نیلوفر کی آنکھوں میں ناگنیں پھنکارنے لگیں ۔

’’ میں کیا کہہ رہا ہوں جی ، وقت خود کہہ رہا ہے ۔ ورنہ سیٹھ جی آج شگوفہ کی بجائے تمہارے قدموں میں ہوتے ۔‘‘

’’ تو میں بوڑھی ہو گئی ۔ یہی مطلب ہے نا ؟‘‘

’’یہ تو میں نے نہیں کہا ، مگر ایسی نئی نویلی بھی نہیں ۔‘‘

’’ میں ڈھل گئی ہوں ۔‘‘ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا بلاؤز تار تار کر ڈالا اور تن کر کھڑی ہو گئی ۔

’’ دیکھ اندھے ۔‘‘ پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ اس بپھرتے ہوئے طوفان کو دیکھتے رہ گئے ۔ بیگم کے ہاتھ سے سلاد

کی پلیٹ چھوٹ پڑی ۔

'' ہے ہے نامراد ۔ دیوانی ہوئی ہے کیا ؟ شرم نہیں آتی ؟''

'' نہیں آتی شرم ۔'' نیلوفر نے آنسوؤں بھرا قہقہہ لگایا اور جھٹکے سے بکھرے ہوئے بال پیچھے پھینک کر بالکل احسان صاحب کے سر پر چڑھ آئی ۔

'' دیکھ حرامزادے ۔ میں ڈھل گئی ہوں ۔ تو اب میا کاہے کو مر گئی رے ؟'' احسان صاحب سہمی ہوئی ہنسی ہنسے اور آستین سے پسینہ پونچھ ڈالا ۔

'' چل جا کپڑے بدل ۔'' بیگم نے اس کا بازو پکڑ کر گھسیٹا ۔

'' نہیں بدلتے ۔'' نیلوفر نے ان کا ھاتھ جھٹک دیا ۔

'' سامنے فلیٹ میں مسٹنڈے کھڑے دیکھ رہے ہیں کمبخت ۔''

'' دیکھنے دو ۔ دیکھو جی مجھے غصہ دلاؤ گی تو ایسی کی ایسی سڑک پر چلی جاؤں گی ۔'' وہ بالکنی کی طرف مڑی ۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ بالکنی میں جاتی ، بیگم نے دھائی ڈال دی ۔ احسان صاحب کوگالیاں دینے لگیں ۔ انہوں نے لپک کر کولیا بھر لی اور اسے صوفے پر پٹخ دیا ۔

پھر جو گھمسان ہوئی ہے تو احسان صاحب ، بیگم ،

باورچی اور آیا ایک طرف ، دوسری طرف تنگ دھڑنگ نیلوفر نے سب کی دھجیاں بکھیر دیں ۔

جتنی توڑنے کے قابل چیزیں تھیں ریزہ ریزہ کر ڈالیں ، پھر جو بھی ہاتھ آیا اٹھا اٹھا کر بالکنی سے نیچے پھینکنے لگی ۔

اور اسی وقت جیسے جادو کے زور سے سیٹھ سورج مل کنوڈیا کمرے میں آ گئے ۔ چپ کھڑے وہ چند لمحوں تک اس آپا دھاپی کو دیکھتے رہے ، مسکراتے رہے ۔

" اسے چھوڑ دو ۔ " انہوں نے احسان صاحب کو آہستہ سے ہٹایا ۔ ان کی آنکھوں میں میٹھی میٹھی آنچ سلگنے لگی ۔ ابلتی چھلکتی نیلوفر پر انہوں نے ایک منٹ میں قابو پا لیا اور وہ نیلوفر ، جو ہزار نخرے کرنے کی عادی تھی ، جو احمد بھائی سے دانتوں سے جوتے اٹھوایا کرتی تھی اور اپنے پیر دبوایا کرتی تھی ، کٹی پتنگ کی طرح ان کی آغوش میں بہہ گئی ۔

عیاشی اس کے خون میں رچ چکی تھی ۔ دس برس سے اس کی زندگی کا مقصد صرف جسمانی لذت پرستی بن چکا تھا ۔ سیٹھ کی چند دنوں کی بے رخی نے اسے دہلا کر رکھ دیا ۔ سیٹھ جی نئی لڑکی کے چکر میں پھنس گئے ۔ تو کیا واقعی وہ ڈھل گئی تھی ؟ نہیں — وہ اتنی ڈراؤنی بات سوچ

بھی نہیں سکتی تھی ۔ اس کے غرور کو ٹھیس لگتی تھی
یہ جسم ھی تو اس کا کل اثاثہ تھا ۔ اس کے بغیر وہ بالکل
معدوم تھی — غایب تھی ۔ رونا پیٹنا ہؤا ۔ سیٹھ نے اس
کے روم روم کو چوم کر قسمیں کھائیں ، توبہ کی ، جر مانے
ادا کیے ۔ ادھر کچھ کم آگ نہیں لگی ھوئی تھی ۔ وہ
لڑکی تو بس یوں ھی اسے چھیڑنے کے لیے ڈال لی تھی ۔
نہایت کمینی نکلی ۔ اسے تو پکچر میں لے کر پچھتا رہے ھیں ۔

وہ رات ایسا معلوم ھوتا تھا اس کی سہاگ رات ہے ۔
سیٹھ نے نیچے موٹر میں سے اپنا اٹیچی کیس منگوایا اور
اسے جواھرات سے لاد دیا ۔ ماں کے پیٹ والا جوڑا پہنے ، سر
سے پیر تک زیور میں لدی وہ ان کے ھاتوں میں کھیلتی رھی ،
کھلتی رھی ۔

''اچھا کپڑے پہن کر تیار ہو جاؤ ۔'' انہوں نے گلاس
اس کے ھونٹوں سے چھین کر پیار سے کولھے پر تھپڑ لگایا ۔

''کیوں ؟''

''کہیں چلیں گے ؟ ''

''کہاں ؟ ''

''جہاں جی چاہے گا ۔ اٹھو ۔''

وہ اپنے سارے تیر ترکش سنبھالتی ، بے حیائی سے شرماتی ،
شمشیر برہنہ بنی اٹھی اور غسل خانے میں بھاگ گئی ۔

" ارے سنو تو ۔"

" کیا ؟ " وہ اٹھلائی ۔

اُس نے دونوں ہاتھ چوکھٹ پر رکھے اور پلٹی ۔ آج وہ اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی ۔ ایسی کم تیسی جوان چھوکری کی مہارت بھی آخر کوئی شئے ہے ۔

" اوورسی کی بزنس ہوگئی ۔"

" سچی ؟ " وہ چھم سے پھر اُن کے گھٹنے پر آ کر لد گئی ۔

"ہاں — ایک لاکھ پانچ ہزار کی ہوئی ہے ، جس میں سے پینتالیس ہزار بلیک ۔"

" وہ ہمارے ۔"

" تمہارا تو سب کچھ ہی ہے ، مگر ..."

" آپ بھی ؟ " وہ اترائی ۔

" ظاہر ہے — مگر ابھی کتنا بلیک ہمیں بھی تو بھرنا ہے ، جاؤ جلدی سے تیار ہو جاؤ ۔ بس کانٹرکٹ پر دستخط کر دو ، تاکہ کل ایڈوانس مل جائے ۔"

" اُوں — پہلے پپی دو ۔"

" سیٹھ جی نے نیٹ وھسکی کا ایک بڑا سا گھونٹ منہ میں لیا اور اُس کا سر اپنے گھٹنے پر ٹکا کر اُنڈیل دیا ۔ جب وہ دستخط کر رہی تھی تو سیٹھ کے ایک ہاتھ

میں کاغذات تھے اور دوسرے ہاتھ میں محبت کا پیغام ۔

سیاہ ساڑھی اور جگمگاتے زیور پہنے جب وہ ملکۂ شب بنی ان کے ساتھ جانے کے لیے نکلی تو اس کی آنکھوں میں آسمانوں کا نور تھا اور قدموں میں لرزش ۔ اس نے ایک نظر سہمے ہوئے احسان صاحب پر ڈالی اور دوسری نواسی کو کھانا کھلاتی ہوئی ماں پر ۔ اس کا جی چاہا ابھی ، اسی وقت ان سے بچی کو چھین لے اور پھر کبھی ہاتھ نہ لگانے دے ۔ وہ دونوں کو مزہ چکھا دے گی ۔ آج سیٹھ سے کہہ کر وہ اپنے لیے الگ فلیٹ لے گی ، جہاں وہ اپنے کلیجے کے ٹکڑے کے ساتھ چین سے رہے گی ۔ اب خدا کرے سیٹھ کی بیوی مر جائے تو بس پھر اسے زندگی سے کوئی شکایت نہ رہے گی ۔

وہ رات — نیلوفر کی اصلی معنوں میں سہاگ رات — کتنی حسین تھی! سیٹھ جی پر پھر سے نوجوانی آ گئی تھی ۔ پچپن برس کی عمر میں بھی ان کی ہر بات میں امنگ تھی ۔ احمد بھائی تو ایک سزا تھے ۔ منوہر حماقت ۔ مگر سیٹھ جی تو جیسے اور جلانے کا طریقہ جانتے تھے ۔

پھر اسے کچھ یاد نہ رہا ۔ وہ کہاں ہے ؟ کن آسمانوں پر اڑ رہی ہے ؟

جب اس کی آنکھ کھلی تو بڑی دیر تک دنیا گھومتی

رہی۔ جب نگاہیں کچھ ٹھیریں تو اس نے دیکھا وہ ایک اجنبی کمرے میں ہے ۔ آس کی سیاہ ساڑھی ، جو رات کے پھیلے ہوئے آسمان کی طرح جگمگا رہی تھی ، بیچ کمرے میں اژدھے کی طرح کنڈلی مارے پڑی تھی ۔ اس کے جسم پر کوئی زیور نہ تھا ۔ اس کا جی دھک سے ہوگیا ، مگر پھر وہ اپنی بیوقوفی پر مسکرا دی ۔ سیٹھ نے اس کا ایک ایک زیور اتارا ہو گا ۔ کاش وہ اتنی مدھوش نہ ہوتی تو ان کے لمس کی لذت سے محروم نہ رہتی ۔ مگر کوئی سامان بھی نظر نہ آیا ۔ شاید دوسرے کمرے میں ہوگا اور سیٹھ نہا رہے ہوں گے ، یا شاید دوسرے کمرے میں ہوں گے ۔ مگر انداز ے سے معلوم ہؤا دوسرا کمرہ ہے ہی نہیں ، سنگل روم ہے ۔ جی گھبرانے لگا ۔ دروازے پر دستک ہوئی اور بیرہ چائے کی ٹرے لے کر آیا ۔ اس نے جلدی سے اپنے اوپر چادر گھسیٹ لی ۔

" صاحب کہاں ہیں ؟ "

" کون سا صاحب ؟ ادھر تو کوئی صاحب نہیں آیا ۔"

" کیا بکتا ہے گدھے ۔"

" سچی بیگم صاحب ، آپ کا ڈرائیور آپ کو لایا تھا ۔ رات بہت ہو گئی تھی ، پر اس نے ڈبل بے کیا ، تب مینیجر راضی ہؤا ۔ وہ بولا میم صاحب سک ہے ۔" بیرا معنی خیز انداز میں مسکرایا ۔ وہ جانتا تھا چادر کے نیچے مال

برا نہیں ۔

نیلوفر کا دل بری طرح دھک دھک کرنے لگا ۔ نہیں ۔ نہیں ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟ اس کا دل تو باجی ہے جو خواہ مخواہ شک کرتا ہے ۔ سیٹھ نے اسے ڈرائیور کے ساتھ بھجوا دیا ؟ ” تو وہ کون تھا جو رات کو...“ وہ دماغ پر زور ڈال کر سوچنے لگی ۔ کوئی تھا ضرور ۔ پاس تکیے پر بھی کسی کے سر کا نشان بنا ہؤا تھا ۔

تو کوئی تھا ضرور ۔ سیٹھ نہیں تو پھر کون ؟ پھر اس کے کپڑے اور زیور کس نے اتارے ؟ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ۔ وہ کون آسیب تھا جو رات کی تاریکی میں اس سے پیار کر کے چلا گیا ؟ اور جو چپ چاپ اس کا گلا دبا دیتا تو؟

مگر جب مینیجر نے بھی بیرے کے بیان کی تصدیق کی تو وہ وہیں کاؤنٹر پر سر رکھ کر رونے لگی ۔

” ہوٹل کا بل تو چکا دیا گیا ہے ۔ آپ پریشان کیوں ہوتی ہیں ؟ شاید آپ کی طبیعت زیادہ خراب تھی اور آپ کو یاد نہیں رہا ۔ اکیلی ہی آئی ہوں گی ۔ “ وہ ہمدردی جتانے لگا ۔

اس کا جی چاہا کتے کا منہ کھسوٹ ڈالے ، مگر ضبط اس کی عادت ِ ثانی بن چکا تھا ۔ اسے احمد بھائی کی ہائیریا زدہ ہو برداشت کرنے کی عادت ہو گئی تھی ۔ سورج مل جی

کی ڈکاروں میں سگندھ آنے لگی تھی ۔ اب مینیجر کی گھومی گھومی پر معنی باتوں کو سہارنا کون سا مشکل کام تھا ؟

'' اچھا ایک ٹیکسی منگوا دیجیے اور کمرے کا کرایہ ...'' اس کے پاس ایک کوڑی بھی نہ تھی ۔

'' اب گاڑی کا وقت تو نکل گیا ۔ شام کو ریس میں نہیں جائیے گا ؟ '' وہ پھر گیلی گیلی مسکراہٹ بکھیرنے لگا ۔

'' نہیں میں گھر جاؤں گی ۔ اے روڈ ، چرچ گیٹ ۔''

'' میڈم یہاں سے ٹیکسی میں بمبئی جا کر کیا کریں گی ؟ اگر شام تک رک جائیں تو میں اپنی کرائسلر میں پہنچا سکتا ہوں ۔''

'' ٹیکسی منگواتے ہیں یا نہیں ۔''

'' مگر شاید آج کوئی ٹیکسی بمبئی کے لیے آسانی سے نہ ملے ۔''

'' کیا بمبئی بمبئی بک رہے ہیں ۔''

'' میرا مطلب ہے پونا سے بمبئی تک کے لیے ٹیکسی ۔''

'' پونا ؟ ''

'' جی پونا ہوٹل ۔ بورڈ نہیں دیکھا آپ نے ؟ شاید رات کو کچھ زیادہ ... میرا مطلب ہے طبیعت خراب تھی ۔''

وہ پھر کھیسیں کاڑھنے لگا ۔

'' اوہ — ہاں ۔'' وہ جھوٹ بولی ، '' تو کیا سیٹھ جی

کا فون آیا تھا ؟ ''

وہ جی ہی جی میں سسک کر دعائیں مانگنے لگی : کاش سیٹھ جی کے گھر سے فون آیا ہو کہ رات کو ان کی بیوی کا ہارٹ فیل ہو گیا ۔ اور سوتے میں وہ بڑی پیاری لگتی ہے نا ، اس لیے انہوں نے اسے جگایا نہیں ، چپ چاپ اسے چوم کر چلے گئے ہوں گے ۔

'' کون سے سیٹھ ؟ ''

'' کنوڈیا سیٹھ ۔''

'' کون ؟ رگھو مل جی کہ تیج مل جی ؟ ابھی پچھلی اتوار کو تو یہاں مل جی آئے تھے ۔ کسی زمانے میں شکنتلا بائی سے بڑے زور کا عشق چلا تھا ۔ وہ بڑے سیٹھ رونکٹا پر لٹو تھی اور ... ''

'' میں سورج مل جی کو کہہ رہی ہوں ۔'' نیلوفر جھلا گئی ۔ یہ مردے کتنے سیٹھ ہیں ؟ باپ ، بیٹے ، پوتے ، سب ہی اسی لت میں پڑے ہوں گے ۔

'' سورج مل جی ؟ ''

'' ہاں ۔''

'' تو ؟ ''

'' تو کیا — وہ رات کو آئے تھے ہمارے ساتھ ! ''

'' میڈم یہاں کوئی سیٹھ ویٹھ نہیں آئے رات کو ، آپ

اکیلی آئی تھیں ۔ شاید کوئی ٹیکسی والا آپ کو اٹھا کر کمرے میں لے گیا تھا ۔''

ٹیکسی ڈرائیور ! نیلوفر کا سر لٹو کی طرح سنسنانے لگا ۔

نہیں — نہیں وہ سیٹھ جی ہی تھے ۔ وہ یونہی اُسے کولیا بھر کے اٹھا لائے تھے ۔ وہی تھے ۔ دھی بڑوں میں بسی ہوئی ڈکار بھی لی تھی اُنھوں نے ۔ وہی تھے — اُسے لٹانے لگے تھے تو اُس نے ان کے گریبان کو دانتوں سے پکڑ لیا تھا ۔ اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ وہیں زمین پر پسر گئے تھے ۔

مگر نہیں ۔ '' آن کے '' گریبان میں تو ہیرے کے بٹن نہیں تھے ! تب تو وہ ٹیکسی ڈرائیور ہی تھا ۔ ایک دم اُس کے پیر لرزنے لگے ۔ وہ چکرا کر برآمدے میں پڑی کرسی پر گر گئی ۔

'' میڈم! '' مینیجر لپکا ، '' چلیے اپنے روم میں چلیے ۔''

'' مجھے کال کرنا ہے ۔'' ناشتے کے بعد اس نے بیرے سے کہا ۔

'' ضرور ضرور ۔'' مینیجر جیسے دروازے کے پیچھے ہی کھڑا تھا ، فوراً مسکراتا ہؤا اندر آ گیا ۔ نیلوفر اُسے دیکھ کر چڑ گئی ۔ کمبخت کتنا مسکراتا ہے ، اس کے جبڑے بھی

نہیں دیکھتے ۔

" میرا پرس گاڑی میں سے گر گیا ۔ سیٹھ سے میں نے بہت کہا : روکو روکو ۔ مگر کہنے لگے : لعنت بھیجو ۔ میں نے کہا : اس میں سات سو کے نوٹ ہیں ۔ بولے : لعنت بھیجو ۔ " وہ جھوٹ کا تانا بانا جوڑنے لگی ۔ " پھر انہیں تار ملا کہ آن کی بیوی کی حالت خراب ہے ۔ "

حالانکہ وہ جانتی تھی سیٹھوں کی بیویوں کی نہ حالتیں کبھی خراب ہوں اور نہ وہ کبھی مریں ۔ مگر اپنے دل کو سمجھانے کے لیے داشتائیں شاید یہی خواب دیکھتی رہتی ہیں ۔ شاید ان کی بیویاں داشتاؤں کی موت کے حسین سپنے دیکھا کرتی ہوں گی ۔ حالانکہ ان سیٹھوں کے یہاں نہ بیویوں کا ٹوٹا ہے نہ داشتاؤں کا ۔ بیویاں نہیں مرتیں اور داشتائیں آ جاتی ہیں ، پہلی داشتائیں نہیں مرتیں کہ نئی آ جاتی ہیں ، جیسے ہر سال نئے ماڈل کی موٹر آ جاتی ہے ۔ نئے مال کی کچھ کمی نہیں رہتی ۔

" مگر ٹرنک کال کی کیا ضرورت ہے ؟ یہ ہوٹل بھی تو آپ کا ہے ۔ " مینیجر نے جذبات میں لتھڑی ہوئی آواز میں کہا ۔ نیلوفر میں چونکنے کی بھی صلاحیت نہیں رہ گئی تھی ۔ ٹرنک کال کرتے وقت خود اسے کوفت ہو رہی تھی ۔ اماں سوالات کی بوچھاڑ کر دیں گی ، بال کی کھال نکالنے لگیں

گی ؛ مکان کے کرائے اور بچوں کی فیس کا دکھڑا رونے لگیں گی ، کوڑی نہیں بھیجیں گی ۔ وہ جانتی ہیں ابھی میری چیک بک میں صفحے باقی ہیں ۔ چیک کہیں بھی ، کسی بھی '' بینک '' میں کیش کرایا جا سکتا ہے ۔ مینیجر کنگال تو نہیں ۔

'' تو شام کو ریس پر چلیے گا ۔'' مینیجر نے آنکھوں میں رس آنڈیل کر کہا ۔

'' بھئی ہمارے کپڑے ...'' وہ ٹھنک کر بولی ۔

'' کپڑوں کی فکر نہ کیجیے ۔ '' خوشی سے بے چارے کی گھگی بندھ گئی ۔

اسی وقت کرائسلر میں بیٹھ کر وہ مین بازار گئی ۔ دو تین ڈرین پائپ اور ٹی شرٹ ، نائیٹ سوٹ ، ایک ڈریسنگ گاؤن اور میک اپ کا سامان خریدا ۔ تین چار ساڑھیاں خرید کر بلاؤز سلنے دے دیے ۔ گھنٹہ بھر میں درزی نے تیار کر دیے ۔

ریس کورس پر گھوڑوں سے زیادہ مینیجر صاحب کی منہ زوریوں سے واسطہ پڑا ۔ وہ جلد سے جلد اپنی وصولی پر جٹے ہوئے تھے ۔ کئی واقف کار ، جو بمبئی سے ریس کھیلنے آئے تھے ، ملے ۔

'' کہیے سیٹھ صاحب تو اچھے ہیں ؟ '' رسماً کئی

لوگوں نے پوچھا ۔

''جی ہاں ۔'' اس نے یونہی جواب دے دیا ۔ اسے یقین تھا کہ ان لوگوں کو قطعی نہیں معلوم کہ آج کل وہ کس سیٹھ سے وابستہ ہے ، مگر شاید اُس کی کہانی اُس کے چہرے پر لکھی جا چکی تھی کہ وہ سیٹھوں ہی کی گیند ہے ۔ مینیجر صاحب بھی اس بات پر سینہ تان کر چلنے لگے کہ آخر خدا نے اس قابل کیا کہ وہ بڑے آدمیوں کی سیکنڈ کلاس گاڑیوں کی طرح اُن کی محبوبائیں بھی وقتی طور پر خرید سکیں۔آج تو مینیجر کی قسمت واقعی ساتویں آسمان پر تھی ۔ جو بھی نوٹ اُس نے نیلوفر کے ہونٹوں سے لگا کر گھوڑے پر ڈالا ، دوگنا چوگنا ہوکر لوٹا ۔ اور جب نیلوفر انہیں اپنے ہونٹوں سے لگائے گی تو وہ خود بھی دونے چوگنے ہو جائیں گے ۔ انہوں نے وہیں نیلوفر کو اس کا کمیشن تھما دیا ۔ مگر اس کے پاس پرس نہیں تھا ، اس لیے مینیجر نے اُس کا حصہ رکھ لیا ۔ آنہیں اس پر بے اختیار پیار آ رہا تھا ۔ وہ ان کی محبوبہ ہی نہیں ، نجر بٹو بھی تھی ، جس نے اُن کی قسمت کو جگمگا دیا تھا ۔

گھوڑے دوڑ رہے تھے ۔ جا کی اُن کی پیٹھوں پر بندروں کی طرح چپکے ہوئے تھے۔ لال ، پیلے ، اودے ، نیلے بندروں پر جم غفیر کی نگاہیں چپکی ہوئی تھیں ۔ اُن کے ہاتھوں میں

ننھے ننھے چابک تھے اور جوتوں کی ایڑیاں گھوڑوں کے حساس رگ پٹھوں کو چھیڑ رہی تھیں۔ بھڑکدار ساڑھیاں اُچھل اُچھل کر گھوڑوں کی ہمت بندھا رہی تھیں۔ایک نہایت سفید، ھتنی کی طرح موٹی، پارسی لیڈی دھپا دھپ کود رہی تھی اور جوش میں اپنے پاس بیٹھے ہوئے لمبوترے سے شخص کو پیٹے ڈال رہی تھی۔ مگر اُسے کچھ خبر نہ تھی۔ وہ اپنی سیٹ پر بالکل ایسے اُچھل رہا تھا جیسے وہ بھی جاکی ہو اور بجائے گھوڑے کے اونٹ کی پیٹھ پر سوار ہو۔ دو نوجوان میاں بیوی ہر ریس کے بعد آپس میں جھگڑنے لگتے۔ یقیناً وہ میاں بیوی ہی ہوں گے، کیونکہ اپنی ہار کا الزام وہ قطعی ایک دوسرے کے سر تھوپے جا رہے تھے۔ یہ گھوڑوں کا نصیب ہے کہ جب تک دوڑتے رہیں، جیتتے رہیں، انہیں سونے کا نوالہ کھلایا جاتا ہے، بوڑھے ہو جاتے ہیں تو گولی مار دی جاتی ہے۔

ایک دم نیلوفر کو احسان صاحب کے الفاظ یاد آ گئے۔ وہ بوڑھی تو نہیں ہو رہی ہے؟ مگر کب تک نہ ہو گی؟ دس سال بیت گئے۔ آنے والے دس سالوں کا خیال کر کے اُسے پسینہ آ گیا۔ دس سال بعد وہ کیا کرے گی؟ سیٹھ سورج مل کی عنایت سے بیٹی بالکل تھوا ہے۔ ریس کا گھوڑا تو شاید کبھی نہ بن سکے، تانگے یا اِکّے میں بھلے ہی جت جائے۔

تو پھر یہ آنے والے دس سال اُس کے لیے کیا کچھ لائیں گے؟ سیٹھ کے بعد مینیجر — اور؟ — اور؟ کتنی سیڑھیاں ہیں اُترنے کو؟ اور آخری سیڑھی کے بعد کیا ہے؟ پکی زمین یا خلا؟

اس کا دل مسلنے لگا ـ جاکی کا بوجھ اُس کے کندھوں پر اور بھاری ہو گیا ـ بھاری بوٹ کی ایڑیاں کوکھ میں دھنسنے لگیں ـ چابک دماغ میں کڑکنے لگے ـ جاکی اس کی ممی، احمد بھائی، احسان صاحب، سیٹھ جی، ساری دنیا!

'' اب چلیے ـ '' وہ ایک دم کھڑی ہو گئی ـ

'' ارے ابھی اصل ریس شروع نہیں ہوئی ـ ''

'' نہ ہو، میری بلا سے، میں تو جاتی ہوں ـ ''

'' مگر سنو تو ـ بس یہ آخری ریس ہے ـ پیسہ لگا دیا ہے، چھوڑ کر کیسے چلوں؟ بس پانچ منٹ کی بات ہے ـ ''

نیلوفر نے ابھی کھلا دھندہ نہیں کیا تھا ـ سورج مل جی کو تو وہ اپنا شوہر ہی بنا بیٹھی تھی ـ بالکل گھرستن بن گئی تھی ـ اس کے بعد بھی بالکل ھیاؤ نہیں اٹھا تھا ـ مینیجر آسے بڑی ہی نیچی سیڑھی معلوم ہو رہا تھا ـ ٹیکسی ڈرائیور کو تو وہ سیٹھ ہی سمجھی تھی، اس لیے اس کا ضمیر صاف تھا ـ وہ اپنے ذہن میں آسے بجائے ٹیکسی ڈرائیور کے ایک نا معلوم اور پر اسرار ہستی سمجھ کر اپنا دل بہلا

رہی تھی ۔ اس نے دماغ پر بہت زور ڈالنے کی کوشش کی ، مگر کچھ یاد نہ آیا کہ ٹیکسی میں کیسے آ گئی ؟ وہ تو سیٹھ کی گاڑی میں تھی ۔ کیا سیٹھ آسے ایک انجان ٹیکسی ڈرائیور کو پکڑا کر چلتے بنے ؟ ضرور کوئی راز ہے ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟ مگر پھر یہ سوچ کر دل ڈوبنے لگتا : کیوں نہیں ہو سکتا ؟ سب کچھ ہو سکتا ہے ۔ معصومہ نیلوفر بن سکتی ہے ، امی جان نائکہ بن سکتی ہیں ، ابا جان سب کو بھول سکتے ہیں ، بھائی منہ موڑ سکتے ہیں تو پھر سیٹھ کون سا آس کا سگا ہے !

مینیجر کو ہضم کرنے کے لیے اُس نے اتنی شراب پی کہ اگر اُسے کتے کے ساتھ سونا پڑتا تو وہ اُسے بھی اُسی جوش سے چومتی ۔ اس دن اُس نے پستی کی طرف بڑے لمبے لمبے ڈگ بڑھائے ۔ ننگ دھڑنگ سارے کمرے میں ناچتی پھری ۔ پھر غڑاپ سے گرم پانی سے لبریز ٹب میں کود پڑی ۔ مینیجر کی بے تابیوں کو ٹھکرا کر وہ پانی میں اینڈتی رہی ۔ بڑی مشکل سے نکالا تو وہیں کموڈ سے سر ٹکا کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔ اُس کا نشہ اترنے لگا ۔ مینیجر سے ڈر لگنے لگا ۔

”تم — تم میری عزت لینا چاہتے ہو کمینے ! بد معاش ! حرامزادے !“ وہ غسل خانے کا سامان اُٹھا اُٹھا کر اُس

کے سر پر پھینکنے لگی ۔

بیچارہ مینیجر سٹپٹا گیا اور کرسی پر گر کر پسینہ پونچھنے لگا ۔ تب آسے اس پر بڑا رحم آیا ۔ چوپاٹی پر ایک دن ایک لنگڑا کتا پڑا تھا ۔ اس کے زخموں میں سفید سفید چاول جیسے کیڑے ہل رہے تھے ۔ نیلوفر اسے دیکھ کر دھاروں دھار رونے لگی تھی ۔ مینیجر کی پھٹی پھٹی آنکھیں دیکھ کر اسے قے آ رہی تھی ، مگر اس نے اس زخمی کتے کو یاد کیا اور اسے چمکارنے لگی :

'' پچ پچ — موتی موتی — ''

مینیجر سہما ہؤا ، گھگیائی نظروں سے دیکھتا پھر اس کی طرف بڑھا ۔ ڈرتے ڈرتے اس نے تولیہ سے اس کا بدن خشک کیا ۔ وہ چپ رہی ۔ پھر اسے چپ چاپ مسہری پر لٹا کر کمبل اوڑھا دیا ۔ نیلوفر ہنسنے لگی ۔ اترتے ہوئے نشے سے ڈر کر اس نے جلدی جلدی پورا گلاس حلق میں اتار لیا ۔ کمبل کو لات مار کر دور پھینکا ۔ مینیجر بالکل چر مر ہو گیا ۔ نیلوفر نے سفید ہلتے ہوئی چاولوں کی ابکائی حلق میں گھونٹی اور اس کی طرف ہاتھ پھیلا دیے ۔

تین روز میں اس نے اتنی شراب پی کہ ساری عمر کی ملا کر اتنی نہ پی تھی ۔ اسے معلوم ہؤا مینیجر اتنا مشکل نوالہ نہیں کہ گھونسا مار کر حلق کے پار نہ کیا جائے ۔ پرس

خریدنا بھول گئی ، ورنہ وہ غریب تو اس کے حصے سے کہیں زیادہ دے رہا تھا ۔ خیر چلتے وقت لے لے گی ۔ آپے پیسے رکھنے کا سلیقہ نہ تھا ۔ پرس سجاوٹ کے لیے ہاتھ میں پکڑ لیتی تھی ۔ اس نے تو برسوں سے روپیہ غور سے دیکھا بھی نہ تھا ۔ سکے ڈھالنے کی مشین کی طرح وہ روپیہ بناتی تھی ، جسے ممی بڑے سلیقے سے رکھتی تھیں ۔ اس نے کتابوں میں پڑھا تھا : ماں اپنی اولاد کی خاطر دنیا بھر کے دکھ اٹھاتی ہے ۔ چکی پیس کر ، سلائی کر کے بچوں کا پیٹ پالتی ہے ۔ مگر اس کی ماں نے تو چکی چھوڑ کبھی صندل بھی نہ گھسا ۔ نانی جی نے پال پوس کر بڑا کیا ۔ ہمیشہ پھپھیوں ، خالاؤں نے سویٹر بنے ، فراکیں سیں ۔ استانیوں نے پڑھایا ۔ ہاں مجبوراً نو مہینے پیٹ میں ضرور رکھا ۔ ان کا بس چلتا تو کسی انا یا دائی کے پیٹ میں ہی اسے پلوا لیتیں ۔ بس ان نومہینوں کا وہ کرایہ وصول کر رہی تھیں ، مع پگڑی کے ۔

تب وہ دعا مانگنے لگی کہ اللہ کرے ممی مر گئی ہوں ۔ سفید سفید کفن میں آن کا پھولا ہؤا چہرہ دیکھ کر آپے بڑی ہنسی آئے گی ۔ پھر وہ آن کی بڑی مضبوط اور پکی قبر بنوا کر اس پر لوبان جلوائے گی ۔ پھر بچوں کی فیسوں کے تقاضے ختم ہو جائیں گے ۔ زبیدہ کی شادی کے لیے روپیہ کی ضرورت نہ رہے گی ۔ آخر وہ آن کے بچے کیوں پال رہی ہے ؟

وہ بھی ان کی لڑکی ہے، ان کا خصم تو نہیں۔ پھر وہ اسے خصم سمجھ کر تقاضے کیوں کرتی ہیں؟

سارا دن وہ پڑی سوتی رہتی۔ شام کو کرائسلر میں سیر کو جاتی۔ چھ سات بجے لوٹ کر پینے کا پروگرام شروع ہو جاتا۔ رات گئے تک عیش رہتے۔ چوتھے دن اسے ایسا معلوم ہؤا وہ برسوں سے اسی مینیجر کے ساتھ رہ رہی ہے۔ رہتے رہتے جی گھبرا چکا ہے۔ دن کتنے لمبے ہیں، راتیں شیطان کی آنت کی طرح کتنی طویل۔ خواب کتنے الجھے ہوئے، کتنے نا تمام!

جب بور ہو جاتی تو مینیجر کو گالیاں دینے لگتی۔ جوتے مارتی۔ پھر جب وہ لنگڑے کتے کی طرح مری مری نظروں سے اس کی طرف دیکھتا تو ھنس کر اس کے سینے سے لگ جاتی۔ یکسانیت سے تنگ آ کر وہ بمبئی جانے کو تیار ہو ہو گئی۔ مینیجر کی گھگی بندھ گئی۔ اس کا دل بہلانے کے لیے اسے پرائیویٹ فرینچ فلم دکھائے، جنہیں دیکھ کر اسے سچ مچ اُلٹی ہو گئی اور وہ اس کے منہ پر تھوک کر غسلخانے میں بند ہوگئی اور کموڈ سے سر ٹکائے، زمین پر بیٹھی، گھنٹوں روتی رہی۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھوں سے پانی نکلنا بند ہو گیا، جیسے سوتے سوکھ گئے ہوں۔

”یہ کیا حماقت ہے؟“ پھر خود ہی اس نے سوچا اور

بجھے دل سے آ کر پلنگ پر پڑ گئی ۔ سر میں درد ہو رہا تھا ۔ دل میں وحشت کے طوفان اٹھ رہے تھے ۔ وہ ایک دم پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گئی ۔ کمرے میں اندھیرا رینگ آیا تھا ۔ مینیجر نوکروں پر غصہ اتار رہا تھا ۔ لوگ کمروں میں بند بیٹھے نہ جانے کیا کر رہے تھے ۔ الماری میں پڑی بوتل میں مشکل سے ایک پیگ نکلا ۔ چڑ کر اس نے گھنٹی بجا کر بیرے کو بلایا ۔

”ہم کو ٹیکسی لا کر دو ۔ بمبئی جانے کا ہے ۔“

”بمبئی کا گاڑی اس وقت نہیں جائے گی ۔“

اوہ ! اس کے نصیب کی گاڑی کب جائے گی ؟ اس کا جی گھبرانے لگا ۔ وقت کاٹنے کے لیے پلنگ پر پڑے پڑے اس نے پہلے بیئر اور پھر وھسکی پینی شروع کر دی ۔ مینیجر جب سہما سہما آیا تو وہ گندی گندی باتیں کر کے ہنسنے لگی ۔ پھر وہی فلم ، جنہیں دیکھ کر اسے اُلٹی ہو گئی تھی ، دیکھنے کی ضد کرنے لگی ۔

اس دن تو مینیجر نشے میں تھا ، آج نیلوفر نشے میں تھی ۔

”اگر کسی نے رپورٹ کردی تو میرا ہوٹل بند ہو جائے گا ۔“ وہ بہانے کرنے لگا ۔ گئے سال نہ جانے کس نے خبر کر دی ، پولیس نے میرا ناطقہ بند کر دیا ۔ وہ تو بیچ میں نواب صاحب پڑے تب جا کر کہیں پیچھا چھوٹا ،

ورنہ تڑی پار کر دیتے ۔ نواب صاحب نے کہا : میری فلم ہے ۔''

'' پھر ؟ ''

'' پھر کیا ؟ مٹھی گرم کر دی ۔''

'' پھر ؟ ''

'' ارے پھر سالے خود بھی بیٹھ کر دیکھنے لگے ۔''

فلم دیکھ کر پھر نیلوفر حواس باختہ ہو گئی ۔

'' اُف ! کمبخت کیوں دیکھتے ہیں ؟ موت آئے نا مرادوں کو ! ''

'' دل کے بہلاوے کے لیے ۔ دوسرے ...''

'' دوسرے کیا ؟ ''

مینیجر نے مسکرا کر آسے دیکھا ۔

'' جانے دو ۔ ''

'' بتاؤ نا ۔ تمھیں ہماری قسم ۔''

'' سورج مل جی کو شوق نہیں ؟ ''

'' کس بات کا ؟ ''

'' کیوں بن رہی ہو ؟ ''

مینیجر نے آسے بتایا کہ بہت سے ہوٹل میں ٹھہرنے والوں کو عجیب عجیب شوق ہوتے ہیں ۔ لوگ بمبئی میں جب کاروبار سے تھک جاتے ہیں تو یہاں جی بہلانے کو آجاتے

ہیں ۔ اگر کوئی ہوٹل لڑکیاں اور شراب نہ مہیا کرے تو
چار دن میں اجڑ جائے ۔''

'' لڑکیاں کہاں سے بلواتے ہو ؟ ''

'' ارے ہمیں بلوانے کی ضرورت نہیں پڑتی - لڑکیاں خود
یا ان کے دلال الٹا ہمیں کمیشن دیتے ہیں کہ ہم انہیں
سیٹھوں تک پہنچا دیں ۔ کچھ پہلے ہی سے انتظام کر کے
آتے ہیں ۔ میں خود کوئی چیز نہیں سپلائی کرتا ۔ بیرے
سب معاملہ ٹھیک کر دیتے ہیں ۔ بس میں ذرا دوسری طرف
دیکھنے لگتا ہوں ۔''

'' کسی دن دھر لیے جاؤ گے ۔ ''

'' ابھی ایسی کچی گولیاں ہم نے نہیں کھیلی ہیں ۔ چار
کھونٹ چوکس معاملہ نہ ہو تب تک میرے نوکر بھی
منہ نہیں لگاتے ۔ باقاعدہ رجسٹر میں خانہ پری رہتی ہے ۔
افسروں کو کھلانا پلانا بھی پڑتا ہے ۔''

'' وہ کیوں ؟ ''

'' اس لیے کہ بیکار کو تنگ نہ کریں ۔ وہ تو کھونٹا
دھندہ نہ بھی کرو تب بھی ہم لوگوں کی بڑی آفت ہے ۔
کھلاؤ نہ تو آئے دن پریشان کرتے رہتے ہیں ۔ سالا ہیڈ
بیرا بڑا تنگ کیا کرتا تھا ۔ یونین کا لفڑا شروع کر دیا ۔
میں نے بہت سمجھایا کہ میرے آدمیوں کو کبھی پکار کی

دیری نہیں ہوتی ۔ مزے سے جتنا چاہو پیٹ بھر کھانا کھا لو ۔ ٹپ میں مینجمنٹ کا چھ آنے شیئر ہے ، وہ تو خیر کوئی بات نہیں ۔ مگر سالے نے پیر نکالنے شروع کر دیے ۔ آٹھ سال سے میرے ساتھ تھا ، کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی ۔ آپ ہی آپ نہ جانے کیا دماغ میں کیڑا رینگا کہ اُلٹی سیدھی ہانکنے لگا ۔ میں نے کہا : سالے ایسی تیسی تیری اور تیری یونین کی ۔ بس میں نے تین چار ، جتنے بھی آس کے گرگے تھے ، سب کو نکال باہر کیا ۔ ارے حضور اُنہوں نے تو ہوٹل کے سامنے ستیہ گرہ شروع کر دی ۔ آتے جاتے کو ہلکان کرتے ۔ بس میں نے اُنھا کے درست کر دیا ۔"

" کیسے جی ؟ " نیلوفر کو مینیجر کی ڈینگوں میں بڑا مزا آ رہا تھا ۔

" پورے کا پورا بکس پکڑوا دیا بدیسی شراب کا سالے کے گھر میں ۔"

" اے ہے ۔"

" ہزار پانسو کا خرچہ ہوا تو کیا ؟ سارا عملہ خوش ہو گیا ۔"

" کیوں ؟ "

" کورٹ میں تو ایک ہی بوتل کافی تھی ، سو پیش کر دی گئی ۔ باقی کا بکس یہیں ، اسی ہوٹل میں لا کر

کلچھرے اُڑائے سالوں نے ۔''

'' کیسے بد ذات ہو تم لوگ ۔ اور یہ اینٹی کرپشن والے کچھ نہیں کہتے ان کمبختوں کو ؟ ''

نیلوفر خود عرق پی رہی تھی ، مگر اُسے غصہ آگیا ۔

'' ارے کیا اینٹی کرپشن ۔ اپنے یہاں کوئی معمولی لوگ ٹھیرتے ھیں ۔ اپنی بڑے بڑوں سے دانت کاٹی روٹی ہے ۔ مجال ہے جو چوں بھی کر جائے کوئی ۔ ھاں بس اتنا فرق ھؤا ، پہلے ایک کو بھگتنا پڑتا تھا ، اب دو کو ۔''

'' یعنی کرپشن اور اینٹی کرپشن ؟ ''

'' ھاں جی ۔ ''

اُس رات نیلوفر نے کئی اور سیڑھیاں پھلا نگ ڈالیں ۔ مینیجر صاحب کے زیر سایہ اُس نے اُن فلموں سے فن سیکھا ۔ پہلی مرتبہ گانجے کی سگریٹ پی اور مورفیا کا انجکشن بھی آزمایا ۔ دو چار دفعہ دیکھنے کے بعد اُسے اُن فلموں میں مزہ آنے لگا ۔ اُس کا جسم ھی نہیں روح بھی ننگی ہو گئی ۔ وھی نیلوفر ، جو کبھی معصومہ تھی اور ایک دفعہ اُس کی خالہ جان نہاتے میں غسل خانے میں گھس آئی تھیں تو ایسے پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی جیسے وہ کانچ کی بنی ہوئی تھی اور کسی نے پتھر سے چکنا چور کر دیا ۔ خالہ جان نے قسمیں کھائیں کہ غسل خانے میں اندھیرا تھا ، انہیں کچھ

نظر نہیں آیا ، مگر اس کا جی نہ ٹھہرا ، کیونکہ اُس نے تو محسوس کیا تھا ۔ آج اُس کی دنیا ننگی ناچ رہی تھی اور عفریت تال دے رہے تھے ۔

شام کا وقت تھا ۔ نیلوفر کا بدن ٹوٹنے لگا تھا اور بے طرح جمائیاں آرہی تھیں ۔ وہ جس دن سے پونا آئی تھی گھر کی کوئی خیر خبر نہیں ملی تھی ، نہ ہی اُس نے کوئی اطلاع دی ۔ ممی گھبرا تو نہ رہی ہوں گی ؟ وہی ممی جو اُسے ایک دن کے لیے پھوپی کے ہاں بھیجتے جھجکتی تھیں ، کیونکہ اُن کے جوان جوان بیٹے تھے ۔ وہ آج اتنے دن سے غایب تھی مگر شاید اُنہیں فکر نہ تھی ؛ جیسے وہ عورت ہی نہیں ، اُس کی عصمت ہی نہیں ۔ ایک آبروباختہ عورت کی ماں کو کیا ڈر ؟ یہ بھی تو ڈر نہیں کہ کوئی اُس کا گلا ہی گھونٹ دے گا ۔ کوئی کاٹ کر ندی میں بہا دے گا ۔ اب وہ اُن کی ناک نہیں ، چوراہے کی ناک تھی ، جو جڑ سے کٹ چکی تھی ۔

اتنے میں مینیجر صاحب حواس باختہ بھاگے آئے ۔

" غضب ہو گیا ۔ "

" کیا ہؤا ؟ "

" راجہ صاحب آئے ہیں ۔ یہ سورج مل سالہ پکا حرامی ہے ۔ "

" کیا ہؤا ؟ " نیلوفر نے چڑ کر پوچھا ، " کیا

اوٹ پٹانگ بک رہے ہو ؟ کون آجڑے راجہ صاحب آ گئے ؟ اور آ گئے تو تم کاہے کو بوکلا رہے ہو ؟ ''

'' نہیں تو ۔'' مینیجر صاحب بغلیں جھانکنے لگے ۔ مگر پھر جھلا کر بولے : '' سالا کہتا ہے جگا دو ۔ اس کی تو ماں کی ...''

'' چولھے میں جاؤ ، مرو ۔ نہ جانے کیا ھانک رہے ہو ۔ کسے جگا دو ؟ ''

'' تمھیں ۔'' روھانسی آواز میں بولے ۔

'' اے جی میں جاگ تو رہی ہوں ۔'' کاش وہ جاگ نہ رہی ہوتی ، یہ ایک بھیانک خواب ہوتا ، دس برس لمبا ؛ جلتا ، سلگتا دوزخ کا خواب — اور وہ جاگ پڑتی ۔کتابیں اٹھا کر وہ ممی سے ٹھنک کر کہتی :'' آج ھسٹری کا ٹیسٹ ہے ۔ ناشتہ دینا ہے تو جھٹ پٹ دے دیجیے ، ورنہ میں جاتی ہوں ۔ مگر نہیں ۔ شاید وہ سوئی ہی نہیں ۔ کبھی نہیں سوئی ۔ اور نہ کبھی کنوار پتے کی دوشیزہ نیند پھر اس کی آنکھوں کو چومے گی ۔ وہ یونہیں آنکھیں پھاڑے خلا کو تکتے تکتے ایک دن سرد ہو جائے گی ۔ پھر منوں مٹی تلے اس کے سارے سپنے ٹوٹ کر سفید ھلتے ہوئے کیڑے بن جائیں گے ۔

پھر مینیجر نے بتایا کہ سورج مل نے اسے نواب صاحب کو بخش دیا ۔ بخشنا کیا ، وہ دو چار ماہ کے لیے مع بیوی

بچوں کے ھانگ کانگ ، سنگا پور وغیرہ جا رہے ھیں ۔ ابھی تو بیوی بچے جا رہے ھیں ، وہ دھلی سے سیدھے پہنچ جائیں گے ، شگوفہ کے ساتھ ۔ فلم ابھی تو ٹھپ پڑی ھے ۔

’’ میری فلم کو ٹھپ کرنے والے وہ ھوتے کون ھیں ۔ ایسی کی تیسی ان کی ۔ اور شگوفہ کو نکال باھر کروں گی سردار کو ۔ سب کچھ تو میرے ھاتھ میں ھے ۔‘‘

’’ وہ تم جانو ۔ اب اس وقت راجہ صاحب کا کیا ھوگا؟‘‘

’’ ھوگا تمہارا سر ۔‘‘

’’ وہ تمھیں لینے آئے ھیں ۔‘‘ مینیجر نے سسکی لی ۔

’’ مجھے کیوں لینے آیا کتا ؟‘‘

’’ ارے آھستہ بولو ۔‘‘

’’ کیوں آھستہ بولوں ؟ اس کا دیا کھاتی ھوں ؟ ‘‘

’’ کچھ ایسا ھی معاملہ ھے ۔ وہ تمھاری ماں کو مہینہ کا خرچہ دے آیا ھے ۔‘‘

’’ کیا ؟ ‘‘

’’ تم خود بات کر لو ۔‘‘

’’ میں نہیں کرتی بات وات ۔ تم انکار کر دو ۔‘‘

’’ انکار کر دو ؟ مگر ...‘‘

’’ کہہ دو ھم شادی کر رھے ھیں ۔‘‘

’’ ارے رے یہ کیا ؟ کیا کہہ رھی ھو؟ وہ میرا سر

؟کہا جائے گا ۔ جانتی ہو بڑے بڑے عہدے داروں اور منسٹروں کا لنگوٹیا یار ہے ۔ سب کہنے کی باتیں ہیں کہ راجے مہاراجے ختم ہو گئے ۔ اب بے فکری کی زندگی مل گئی ہے ۔ نہ ریاست کی پروا نہ کچھ ۔ مزے سے پندرہ لاکھ پاکٹ منی مل جاتی ہے ، عیش کرتے ہیں سالے ۔ اس ہوٹل پر بہت دنوں سے دانت ہے ۔ میں نے بڑی بنتی کری کہ میری روزی کا ٹھیکرا ہے ، ورنہ وہ تو اسے آج پکڑی دے کر خرید لے ۔ پانچ سال کا میرا کانٹریکٹ ہے ، ختم ہو رہا ہے ۔ بلا کا کمینہ ہے ۔''

'' مگر میں تو اس کے ساتھ نہیں جانا چاہتی ۔''

'' وہ ... وہ کہتا ہے نکال دو ۔''

'' کیا کہتا ہے — نکال دو ؟ اس کے باپ کا ہے ؟ ہوٹل ؟ حرامی پلا !''

'' ہو سکتا ہے ۔ کہتے ہیں بڑی رانی صاحبہ سے مسٹر انجنیر کا بڑا یارانہ تھا ۔''

'' کون مسٹر انجنیر ؟ ''

'' اس ہوٹل کے مالک کا چچا ۔ بے اولاد مرا ، سب بھتیجے کو دے گیا ۔ رانی صاحبہ نے اسے بہت دبا تھا ۔''

'' ہوں — تو پھر نکال دو ۔''

'' یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟ نہیں نیلوفر بائی ۔'' مینیجر

کی آنکھیں بھر آئیں ۔ ’’ میں نے بڑی منت سماجت کی ، سالا ٹھوکریں مارنے لگا کہ ہماری ریس کرتے ہو ۔ وہی اپنی نتنیوں گھاٹنوں تک رہو ۔ دماغ خراب ہوا ہے ۔ کہو ، سالے ہم بھی تو انسان ہیں ۔ دل آجائے تو کوئی کیا کرے ؟‘‘

’’ تو پھر کیا کرو گے ۔‘‘

’’ یہی تو تم سے کہہ رہا ہوں ۔ تم ہی بتاؤ ۔‘‘

’’ مگر میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے ۔‘‘

’’ اب میں کیسے سمجھاؤں تمہیں ۔‘‘

اتنے میں بیرے نے دروازہ کھٹکھٹایا :

’’ راجہ صاحب بولتے ہیں ہم کو دیر ہوتی ہے ۔‘‘

’’ ہاں ہاں ابھی آتی ہیں ۔ نہا رہی ہیں ۔ چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ ۔ اُٹھو ۔‘‘ انہوں نے پھسلتے ہوئے ڈریسنگ گاؤن کا گریبان بند کر کے کہا ۔

’’ نہیں نہاتی ۔‘‘ نیلوفر نے سارے بٹن کھول دیے ۔ مینیجر کی گھگی بندھ گئی ۔ ان کے پسینے میں ترگیلے گیلے ہاتھ ڈریسنگ گاؤن کے پٹ بھیڑنے کے بجائے بھٹکنے لگے ۔

’’ سنو ۔‘‘ اس نے گردن پر سے ان کی رال پونچھتے ہوئے کہا ۔

’’ کیا ؟ ‘‘ مینیجر صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے ۔

"چلو غسل خانے سے نکل کر بھاگ چلیں۔"

"نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مار ڈالے گا۔" ان کی حالت اس چور بچے کی سی تھی جو مالی کے ڈر سے بھاگتا جاتا ہے اور پھل بھنبھوڑتا جاتا ہے۔ آدھا پورا جو بھی ہاتھ لگ جائے۔

"کیوں نہیں؟" نیلوفر نے انہیں پرے دھکیل کر کہا۔

"وہ ... وہ ... بات یہ ہے کہ ... وہ تم تیار تو ہو جاؤ۔"

"پہلے بتاؤ کیوں نہیں؟ کیا میں تم کو پسند نہیں۔"

"ہو پسند۔"

"میرے اُوپر جان جاتی ہے؟"

"جاتی ہے!"

"میرے بنا جی نہیں سکتے؟"

"نہیں جی سکتا!"

"تو پھر چلو بھاگ چلیں۔"

"نہیں ... مگر ..."

"کیوں؟ اگر مگر کاہے کی؟"

"وہ بات یہ ہے، اب تمہیں کیسے سمجھاؤں؟"

"تم نے اتنے پیسے خرچے میرے اُوپر، تمہارا بھی تو کچھ حق ہے۔"

'' ہاں وہی تو کہہ رہا ہوں ۔ اس وقت مجھے بچا لو۔ بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں ۔''

'' کیا سب دے دیے اس نے ؟ '' نیلوفر نے اس کی ہچکچاہٹ سے تاڑتے ہوئے کہا ۔

'' ہاں ۔'' مینیجر صاحب نے آنکھیں چرا کر چھت کی طرف دیکھا ۔

'' اوپر سے کتنے ؟ ''

'' کچھ بہت نہیں ۔''

'' کتنے ؟ بتاؤ ۔'' اس نے لات مار کر کہا ۔

'' دس ہزار ۔'' مینیجر صاحب اس کی زد سے بچ کر دور ہو گئے ۔

'' تو واپس کر دو ۔''

'' واپس ۔ وہ نہیں لے گا ۔''

'' تم منہ پر مار دو جا کے ۔ مجھے چاہتے ہو تو واپس کر دو ۔ نہیں کر سکتے ؟''

'' میں مجبور ہوں ۔''

'' مجبور ہو ؟''

'' ہاں ۔ میں غریب آدمی ہوں ، بال بچوں والا ہوں ۔ مالک مجھے بڑا تنگ کرتا ہے ۔ اس روپے سے میں ایک چھوٹا سا ہوٹل کھول لوں گا ۔ اس نا مراد سے پیچھا

چھوڑے گا ۔''

'' تم بال بچوں والے آدمی ہو ؟''

'' ہاں بائی ۔''

'' اور مجھ پر مرتے ہو ؟'' چپ !

'' میرے بغیر جی نہیں سکتے ؟ '' چپ !

'' میرے لیے جان دے سکتے ہو مگر روپیہ واپس نہیں کر سکتے ؟''

'' مگر اس سے کیا ہوگا ۔ وہ بڑا ضدی ہے ۔ میں اُس سے کیسے ٹکر لے سکتا ہوں ؟ ''

'' اچھا تو اس پیار کی خاطر ایک بار میرے ہونٹ تو چوم لو ۔''

مینیجر بھڑکا ۔

'' دام نہیں خرچنا ہوں گے ۔ مفت ۔ بس ایک بار ۔ لو مجھے بانہوں میں لے لو ۔'' اُس نے ڈریسنگ گاؤن کرسی پر چھوڑ دیا اور کھڑی ہو گئی ۔

اور جب مینیجر صاحب کے گیلے گیلے رال میں تر ہونٹ اس کے قریب آئے تو اس نے اپنے دل کا سارا غصہ ، ساری ہتک منہ میں سمیٹ کر اُس کے چہرے پر تھوک دیا ۔

'' بھئی واہ !'' راجہ صاحب دروازے میں کھڑے آنسو آنکھوں سے ٹٹول رہے تھے ۔ مینیجر سٹ سے باہر نکل گیا ۔

'' دراصل قصور سارا میرا ہے ۔'' انہوں نے ٹھوکر سے دروازہ بھیڑ دیا اور بڑی بے تکلفی سے پلنگ پر اس کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گئے ۔ '' وہ سالانہ مشاعرے کی صدارت کرنا تھی ، آدھر پھنس گیا ۔ بہت کہا : بھئی کسی اور کو پکڑو ۔ مگر نہیں صاحب ، سر ہو گئے کہ حضور آپ کے سوا اس مشاعرے کی صدارت کوئی نہیں کر سکتا ۔ ورنہ کہیے تو مشاعرہ ہی ملتوی کر دیں ۔ اب میں نے سوچا : چیریٹی فنڈ کا مشاعرہ ہے ، جھیل جاؤں تو اچھا ہے ۔ پھر تم جانو جب شعراء جمع ہوں تو کچھ پینے پلانے کا پروگرام چلتا ہی ہے ۔ پھر میں دعوت نہ کرتا ، یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟ بس اسی میں اتنے دن لگ گئے ۔''

نیلوفر ڈریسنگ گاؤن کے بند باندھتی وہیں کرسی پر بیٹھ گئی ۔ اس نے کئی دعوتوں ، پارٹیوں اور مشاعروں میں راجہ صاحب کو دیکھا تھا ۔ ساٹھ باسٹھ کا سن ، مگر لوہے کی لاٹھ بنے رکھے تھے ۔ رنگین مزاج تھے ۔ جب سے ریاست چھٹی تھی محل کی لونڈیاں تو بہت سی ادھر آدھر ہو گئی تھیں ۔ ادھر ادھر کہاں ، سیدھی عیش گھر جا پہنچی تھیں ۔ جو ذرا سلیقے والی تھیں انہوں نے شادیاں کر ڈالی تھیں ۔ باقی وہی دھندہ وسیع پیمانے پر کر رہی تھیں ۔ اب راجہ صاحب کا ٹیسٹ بھی بدل گیا تھا ۔ نام کی فلم اسٹاروں اور تباہ حال

خاندانی بہو بیٹیوں میں دلچسپی لینے لگے تھے ۔ گانا سننے کا بڑا شوق تھا۔ راجہ ہوتے ہوئے بھی جدید ترین سرمایہ‌داری دماغ کے مالک تھے اور بڑی تیزی سے بمبئی اور دوسرے بڑے شہروں میں جائیداد بنا رہے تھے ۔ کئی بڑی ولایتی فرموں میں حصے تھے ۔ ملا بارھل اور پیڈر روڈ پر فلیٹ بنا بنا کر اونچی پگڑی پر اٹھا رہے تھے ۔ انہیں اینگلو انڈین اور یورپین عورتوں سے کراہت آتی تھی ۔ اس معاملے میں وہ انتہائی دیسی تھے ۔ ہمیشہ بدیسی مال پر دیسی مال کو ترجیح دیتے تھے ۔ ہوم انڈسٹری کے اس صیغہ کو ان کی ذات سے بڑی ترقی ملی ۔ نیلوفر پر ان کی عرصے سے نظر تھی مگر سورج مل ھچر مچر کر رہا تھا ، کیونکہ شگوفہ سے پہلے وہ واقعی نیلوفر کو چاہتا تھا ۔ انہیں سورج مل کی ایک گھوڑی بھی پسند تھی ، مگر وہ کسی قیمت پر بھی بیچنے کا ارادہ نہ رکھتا تھا ۔

"سورج مل جی اس گھوڑی کو الگ کرنے کا جب کبھی ارادہ ہو تو مجھے بتائیے گا ۔" وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے ۔ آخر انہوں نے اونچی قیمت لگا کر سورج مل کا ارادہ کروا ہی لیا ۔ انہیں نیلوفر بھی مل گئی اور گھوڑی بھی ۔ صرف سورج مل کی زیر تکمیل فلم مع سارے گھاٹے کے خریدنا پڑی ۔ اس قسم کی خرید و فروخت آپس میں ، دوستوں میں ،

ہؤا ھی کرتی ھے ۔ اس فلم کی قیمت وہ جب چاھیں کھری کرسکتے ھیں ۔ فلم انشورڈ ھے ،گودام انشورڈ ھے ۔ کسی دن بھی آگ لگ سکتی ھے اور مال سے دوگنا نقصان دکھایا جا سکتا ھے تا کہ بڑھتے ھوئے منافع کا کچھ حصہ ادھر ڈوبتا دکھایا جا سکے ۔ یہ سب بزنس کے گر ھیں ۔ ان کی دادر والی کپڑے کی مل میں اتنا منافع ہؤا کہ چھکے چھوٹ گئے ۔ اچھی قیمتی مشین راتوں رات وھاں سے آٹھوا کر آگ لگوا دی ۔ بعد میں وھی مشین کسی دوسرے کی کہہ کر دوگنی قیمت پر خرید لی ۔کچھ گھپلا ہؤا تو شاندار دعوتیں کیں ، یارانے کام آئے ۔ مصیبت یہ ھے کہ راجہ صاحب جس کمپنی کا حصہ لے لیں وہ سونا آگنے لگتی ھے ۔،،

”مگر وہ فلم آپ نے کیسے خریدی؟ وہ تو میری ھے ۔،، نیلوفر نے کھانے پر کہا ۔

”ھاں وھی فلم جوتم نے سورج مل جی کو بیچ دی ۔،،

”میں نے تو خاک نہیں بیچی ۔،،

”میں کچا کام نہیں کرتا ۔ میرے وکیل نے بڑی چھان بین کر لی ھے ۔ تم نے سورج مل جی کو ھنڈیاں لکھ کر دی تھیں ۔،،

”ھنڈیاں ؟ نہیں تو ۔،،

”تم نے کبھی دستخط دیے تو ھوں گے کسی رسید پر ۔،،

" نہیں ۔ ہاں وہ بچوں کو فیس جاتی تھی ۔ انہوں نے صاف سٹوڈیو کے متعلق کو پراپرٹی آتی تھی ۔ اس کے علاوہ کسی پکچر کی سیل کے وقت دستخط کیے ، تو وہ سب و یکھ لیتا تھا ۔"

" تمھارا وکیل یا سورج مل کا ۔"

" اے بھئی میرا وکیل ۔ احسان صاحب ۔ اوہ !" وہ ایک دم سناٹے میں رہ گئی ۔

" احسان صاحب ! ایک حرامی ہے ۔"

" مگر جب تک تو ہمارا جھگڑا بھی نہیں ہؤا تھا ۔"

"سمجھ میں نہیں آتا اس میں جھگڑے کو کیا دخل ہے ۔ سورج مل جی کچھ پیسہ تمھارے نام سے بزنس میں لگانا چاہتے ہوں گے ، مگر احمق تو ہیں نہیں ، اپنی پوزیشن پکی کر لی ہوگی ۔"

اور لوگ کہتے تھے نیلوفر نے سیٹھ کو پھانسا ہے ، دونوں دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہی ہے ۔

"آنھ ، جانے دو ۔ وہ کمبخت بڑا ہی چلتا پرزہ ہے ۔ تم جیسی بھولی لڑکی ہاتھ لگ گئی ۔ حال ہی میں تم نے فلم ان کے نام کی ہے ۔ تمھیں یاد نہ رہا ہوگا ۔"

اور نیلوفر کو یاد آ گیا : اس دن زیور پہنا کو جب سیٹھ نے اپنی ہوس کی پوجا کی تھی تو اس کے دستخط ایک

ہؤا ھی ے تھے ۔

کہ ڈدھی کی بچی!'' اس نے اپنے وجود کو گالی دی ۔ سیٹھ ۔ ھاتھ اسے بچھوؤں کی طرح جسم پر رینگتے محسوس ہوئے اور اس نے پھریری لی ۔

'' اوہ سمجھا ۔ تو تمھیں پتہ بھی نہیں چلا ۔ بھئی یہ کنوڈیا کم بخت جینیس ہے ۔ میری تو عقل دنگ رہ جاتی ہے جب اس کے کارنامے سنتا ہوں ۔ اتنا لمبا چوڑا کاروبار ہے مگر کس خوبی سے معاملہ بٹھایا ہے کہ کوڑی انکم ٹیکس کی آج تک نہیں بھری ۔ یہ انکم ٹیکس والے دس اور پندرہ روپے تو بڑی دھوم دھام سے وصول کرتے ہیں، مگر یہ جو فلم آرٹسٹ لاکھوں بلیک لیتے ہیں اسے نہیں پکڑ پاتے ۔ ڈھائی ہزار سے تین سوا تین ہزار آمدنی والے کی جان کو لاگو ہو جاتے ہیں ۔ اگر سی ۔ آئی ۔ ڈی انہیں گرفتار کرنا چاہے تو سو طریقے تو میں بتا سکتا ہوں انہیں گھیرنے کے ۔ دراصل اس کا بیوپار سینکڑوں ناموں سے پھیلا ہؤا ہے ۔ جتنی لڑکیاں رکھتا ہے ان کے نام سے ساری چار سو بیس کرتا ہے ۔''

'' یا بیوی کے نام سے کرتا ہے ۔''

'' نہیں ۔ اس معاملے میں وہ بڑا شریف آدمی ہے ۔ بیوی کے سیف ڈپازٹ میں صرف سونا اور جواھرات ہیں ۔''

راجہ صاحب صاف اور کھرے آدمی تھے۔ انہوں نے صاف بتادیا کہ معاملہ قطعی بیوپاری ہے ۔ انہیں کبھی عورتوں کی کمی نہیں رہی ، نہ رہے گی ۔ انہیں عرصہ سے ایک ایسی لڑکی کی تلاش تھی جو اونچے طبقے میں سوسائٹی لیڈی کی طرح آ جا سکے۔ انہیں سرکاری حلقوں میں کام پڑتا ہے ۔ وہاں یہ کچرا مال ، جو پون پل یا کلابہ وغیرہ میں ملتا ہے، قطعی نہیں چلتا ۔ انگریزی بولنی آتی ہو ، مگر ہندوستانی کلچر سے واقف ہو ۔ بروں کا چھتہ سر پر بنانے ، مگر دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کرے یا لکھنؤ کی نواب زادیوں کی طرح آداب عرض کہے ۔ ہینڈ لوم کی ساڑھی پہنے، مگر کاک ٹیل کا پیانہ نازک انگلیوں میں تھام سکے ۔ کچھ ایسا کچومر ہو کہ ہر قوم کا فرد مسحور ہو سکے ۔ جسے جاہل ہندوستانی دیکھیں تو انگریز سمجھیں ، اور انگریز آسے اجنتا کی گپھاؤں سے نکلی ہوئی کوئی خوابوں کی شہزادی سمجھیں ۔ پھر ساتھ میں کسی بھاری بھر کم خاندان کی شان و شوکت بھی ہو ۔

آمدنی کم و بیش وہی رہے گی جو کنوڈیا جی کے زمانے میں تھی ۔ ساتھ میں سوسائٹی میں عزت ملے گی ، سو الگ ۔ یوروپین لوگوں سے واسطہ پڑے گا ۔ اپریل کے آخر میں یورپ کے دورے پر جانا ہوگا ۔ ویسے خود وہ ان باتوں میں اب کمی کرنے جا رہے ہیں ۔ صحت پر بھی برا اثر پڑتا

ہے - بہتر ہے کہ سورج مل جی کا قطعی نوٹس نہ لیا جائے۔ ویسے نوٹس لینے کی وہ شخص کسی معاملے میں گنجائش بھی نہیں چھوڑتا -

نیلوفر پکا ارادہ کر چکی تھی کہ وہ راجہ صاحب کو ٹھکرا دے گی، مگر انہوں نے آسے ٹھکرانے کا موقع ہی نہیں دیا - انہوں نے کسی قسم کی چھچھوری خواہشیں بھی نہیں کیں - نیلوفر سے انہوں نے اس کی مرضی بھی نہیں پوچھی - بس جیسے حکم دے دیا -

رانی صاحبہ سے ان کی عرصہ ہؤا بول چال تک بند تھی، مگر بچے سب انہیں کے زیر سایہ پل رہے تھے - باوجود جسمانی خلیج کے روحانی طور پر وہ اب بھی ان سے متاثر تھے۔ انہیں علم و فضل کا خزانہ سمجھتے تھے - اپنی محبوباؤں کو ویسے ہی کپڑے پہناتے تھے جیسے وہ اپنی لڑکیوں کو پہناتیں - سوسائٹی میں وہ الٹرا ماڈرن سمجھی جاتی تھیں - ان کے فیشن اور ٹیسٹ کی دھوم تھی - راجہ صاحب نے دوسرے دن اس کے لیے نئے کپڑے بنوائے - جھم جھم کرتی بنارسی ساڑھیوں کی بجائے بڑے اجنتائی قسم کے لباس خریدے گئے - سونے اور جواھرات کی بجائے نہایت پرانے، مگر جنھیں حال ہی میں جدید ترین تسلیم کیا گیا تھا، زیورات خریدے -

راجہ صاحب کے ہاتھوں میں وہ بالکل کٹھ پتلی بن گئی۔ انہوں نے اسے سوچنے کا نہ موقع دیا اور نہ اس نے ضرورت محسوس کی۔ سوچنے کی اب گنجائش ہی کہاں رہ گئی تھی؟ زندگی کے سارے بھید کھل چکے تھے۔ جو ہونا ہے ہو رہے گا۔ اب دیکھنا ہے یہاں سے آچھل کر وہ کس کی گود میں گرے گی۔ اور پھر ایک دن آئے گا جب وہ آچھل کر خلا میں معلق رہ جائے گی یا کسی چٹان پر گر کر پاش پاش ہو جائے گی۔ آخر کیوں سب اس سے اتنی جلدی آکتا جاتے ہیں۔ وہ سوچتی بہت ہے اور جب سوچتی ہے تو کسی نہ کسی کو برا لگتا ہے۔

اس کی خاک سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ راجہ صاحب نے اس پر دس بارہ ہزار کیوں خرچ کر ڈالے۔بس یونہی اس کا جی ڈر رہا تھا۔ اس نے ان سے بڑے اخلاص سے پوچھا تو وہ مسکرانے لگے۔

'' بھئی میں ان لوگوں میں سے نہیں جو کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ میں تمھارا عاشق نہیں دوست ہوں۔ ایسے کام میں، جس میں تم بھی خوش رہو اور میرا بھی نقصان نہ ہو، مجھے روپیہ لگاتے ہوئے کیوں تکلف ہو؟ ''

'' جھوٹ بولتا ہے نا مراد — اکڑ دکھا رہا ہے۔''

نیلوفر نے سوچا: مجھ پر رعب ڈالنے کے لیے بن رہا ہے۔

مگر وہ دس ہزار نہ بھی دیتا تو مینیجر سے وہ آسانی سے چھٹ سکتی تھی ۔ ضرور کوئی راز ہے ۔ مگر وہ چپ رہی ۔

'' میں سیٹھ کنوڈیا کی طرح انکم ٹیکس مار لینا یا ادھر اُدھر گھَسے دے کر کام چلا لینے کا قائل نہیں ۔ مجھے اُونچی سوسائٹی میں اٹھنا بیٹھنا پڑتا ہے ۔'' انہوں نے پھر اُونچی سوسائٹی کا حوالہ دیا ۔ '' کام تمہیں کچھ بھی نہیں کرنا پڑے گا ۔ مجھے اکیلے سفر کرتے کوفت ہوتی ہے ، تمہیں ساتھ رہنا ہوگا ۔''

'' اور رانی صاحبہ ؟ ''

'' میں کاروبار کی بات کر رہا ہوں ۔ سیرسپاٹے کی نہیں ۔ ضائع کرنے کو میرے پاس ایک لمحہ بھی نہیں ۔''

'' مگر کچھ معلوم بھی تو ہو کہ مجھے کیا کرنا ہوگا ۔''

'' کچھ نہیں ، بس ہوسٹس بننا ہوگا ۔''

'' مگر مجھے تو ہوسٹس بننا نہیں آتا ۔''

'' اس کی تم فکر نہ کرو ۔ تم تو پیدائشی ہوسٹس ہو ۔ پھر میں جو ساتھ ہوں ۔''

''مگر اس کام کے لیے تو کوئی اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی...''

'' اجی گولی مارو اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیوں کو ۔ سوائے استانیاں بننے کے کسی مصرف کی نہیں ہوتیں ۔ اس کے لیے شکل صورت بھی چاہیے ۔ ویسے مس احمد میرے ساتھ کئی سال

رہی ۔ کمبخت ہر سال شادی کر کے چل دیا کرتی تھی ۔ پھر تین مہینے بعد روتی چلی آ رہی ہیں ۔ بڑے بڑے افسروں کو پھانسنے کے لیے جال بچھانے لگی تھی ۔ میں نے بہت سمجھایا کہ تم بےکار شادیوں کے چکر میں پڑتی ہو ۔ شادی تمہارے خون میں ہی نہیں ۔ دوسرے میری بدنامی ہوتی ہے ۔''

'' بھلا آپ کی بدنامی کا کیا سوال اٹھتا ہے ؟''

'' ارے تم نہیں جانتیں ۔ مجھے ان افسروں کی بیویوں سے بھی تو مراسم رکھنا ہوتے ہیں ۔ وہ تو میری جان کی دشمن ہوجاتی ہیں ۔ یوں دوستی میں تو کچھ حرج نہیں ۔ مگر اس کمبخت کو بس شادی سوار ہوجاتی تھی ۔ خوا مخواہ کے فضیحتے کھڑے ہونے لگتے تھے ۔ یہی بات میں تمہارے کان میں ڈال دینا چاہتا ہوں ۔ میں نے سنا تھا تم بھی سیٹھ کنوڈیا سے شادی پر اڑ گئی تھیں ۔''

نیلوفر کھسیانی سر جھکائے رہی ۔

'' ویسے نہیں کہتا ، مگر سچی بات تو یہ ہے کہ ...''

وہ کہتے کہتے رک گئے ۔

'' کہیے کہیے ۔ تکلف کی کیا ضرورت ہے ۔''

'' میں سوچ رہا تھا یہ عورتوں کو شادی کا کیوں اتنا شوق ہوتا ہے ! میں نے بڑی روشن خیال عورتوں کو

دیکھا ہے ، بس گھوم پھر کر شادی پر آ کر تکتی ہیں ۔ مگر بزنس اور شادی کو گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے ۔ تم وہ نائیلون والا گاؤن پہنو گی ؟'' وہ ایک دم سے پٹری بدل کر دوسرے میدان میں دندنانے لگے ۔

نیلوفر بھونچکی رہ گئی ۔

راجہ صاحب جتنی بزنس کی باتیں کر رہے تھے اتنے سوداگر منش نہ نکلے ۔ ان کا محبت کا طریقہ عجیب و غریب تھا ۔ پی کر جب وہ خوب کُس گئے تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے ۔ نیلوفر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے ۔

'' میں بڑا بدنصیب ہوں ۔ مجھے سب غلط سمجھتے ہیں ۔ آج تک کسی نے میرے دل کی تنہائیوں کو نہیں پہچانا ۔ لوگ مجھے شرابی اور عیاش کہتے ہیں ۔ مگر میں ہوش میں ہوں ۔ کیوں میں ہوں نا ہوش میں ؟'' وہ ہچکیوں کے درمیان لمبی سانسیں بھر کر پوچھنے لگے ۔

اور پھر انہوں نے رو رو کر اپنے پہلے عشق کی داستان سنائی : کس طرح انہیں ایک پارسی حسینہ سے جان لیوا قسم کا عشق ہو گیا تھا ، مگر ریاست کے مطلبی لوگوں نے اسے ان سے جدا کر دیا ۔

'' میں بہت دکھی ہوں ۔ مجھے محبت کی ضرورت ہے ۔ سچی اور بے غرض محبت کی ضرورت ۔ اگر کوئی عورت چاہے

تو پھر میرے دل میں جینے کی خواہش پیدا ہو سکتی ہے ۔ معصومہ بی بی مجھ سے پیار کرو ۔'' برسوں پہلے دور کسی نے آواز دی :

'' معصومہ بی بی دوپٹہ سنبھال کے اوڑھو ، قرآن پاک سامنے رکھا ہے ۔''

نیلوفر نے معصومہ کی طرف پیار سے دیکھا اور رو پڑی ۔

'' معصومہ بی بی تم رو رہی ہو ؟ تمہیں میرے اوپر ترس آ رہا ہے ۔'' راجہ صاحب ھچکیوں سے رونے لگے ۔ معصومہ سر پر آنچل کا بکل مارے ہل ہل کر انتیسواں پارہ پڑھ رہی ہے ۔ اگلے جمعے قران شریف ختم ہو جائے گا ۔ پھر تشرح ہوگا ۔ گلابی پوتھ کا پاجامہ اور پستی جالی کا دوپٹہ ۔ آس کے پنڈے سے بگولے اٹھنے لگے ۔ دادا ابا کی بوئی ہوئی مہندی سے شعلے اٹھ اٹھ کر فضا پر چھا گئے ۔

'' اسکول میں جو نام تھا وھی ٹھیک رہے گا — معصومہ بیگم ۔''

'' نہیں ۔'' نیلوفر نے چڑ کر کہا ۔ دور — اس کی دنیا سے دور — آس کی ہم جماعت لڑکیاں : فرخانہ انور علی ، تہمینہ مرچنٹ ، گل بانو وزیر حسن ، نورا پیر سن ، معصومہ — وہ سب جدا ہو گئیں ۔ وہ زندہ ھیں ۔ معصومہ مر گئی اور اب وہ اس کو قبر میں سے کھینچ کر نہیں نکال سکتی ۔ سفید

سفید ہلتے ہوئے کیڑوں نے اب خاک بھی نہیں چھوڑی ۔ نہیں اسے مت چھیڑو ۔ ورنہ یہ خواب بھی بکھر جائے گا ۔ اس کی دوشیزگی کو نہ مسلو ۔

مگر راجہ صاحب ضد کرنے لگے :

'' نیلوفر کچھ رنڈیوں جیسا نام لگتا ہے ۔ تم اس باریکی کو نہیں سمجھو گی ۔ پوزیشن گر جاتی ہے ۔ نام ہی سے معلوم ہوتا ہے کوئی سالی ٹکھیائی ہے ۔ یہ سمجھنے والے ہی سمجھ پاتے ہیں ۔''

'' کیا سمجھ پاتے ہیں ؟ ''

''پولیس ایکشن کے بعد بہت سی رنڈیوں نے کہنا شروع کر دیا کہ وہ فلاں جنگ یا فلاں عہدے دار کی بہو، بیٹی یا رشتہ دار ہیں ۔ میاں چھوڑ کر پاکستان چلا گیا ہے ۔ یوں ٹکھیائیاں بھی شریف زادیوں کے بھاؤ بکنے لگیں ۔''

'' مگر اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے ۔''

'' بہت فرق پڑتا ہے ۔ لیبل کا فرق ہو ، خواہ بوتل میں ایک ہی چیز ہو ۔ یہی چاٹ پکوڑے سڑک پر کھڑے ہو کر کھانے کی بجائے کسی شاندار ریسٹوران میں کھا کر اور ہی لطف آتا ہے ۔''

'' اچھا ایک بات پوچھوں ؟ ''

'' پوچھو میری جان ۔ ایک نہیں ہزار باتیں پوچھو ۔''

'' کاروبار کے سلسلے میں ... میرا مطلب ہے کیا اس سے کام چل جاتا ہے ؟ ''

'' میں سمجھا نہیں ۔''

'' کیا لڑکیاں اور دعوتیں ۔''

'' نہیں جانم ۔ توبہ کرو ۔ یہ تو بس یوں سمجھو کہ ہار پھول کی طرح ہوئیں ۔ دعوتیں پارٹیاں تو سب آوپری باتیں ہیں ، ذرا مرغی گلانے کے لیے ۔''

'' مرغی ؟ ''

'' ہاں گلانے کے لیے ۔ تم نہیں جانتیں دنیا میں کیسا کیسا گدھا پڑا ہے ۔ دو چار دعوتیں دو ، اول درجے کی شراب ہو ، حسین چھوکریاں ہوں تو انسان ذرا کھل جاتا ہے ۔ راہ و رسم بڑھتی ہے ، جو گھری دوستی کی صورت اختیار کر لیتی ہے ۔ اور پھر جب یارانہ ہو جائے تو کام بھی بنا سمجھو ۔ دو چار دعوتوں کے بعد بقول کسے مرغی گل جاتی ہے ۔''

'' ہم نے تو سنا ہے رشوتیں دینا پڑتی ہیں ۔''

'' ہاں بھئی ، مگر رشوتیں دینے کی بھی تو پہنچ ہونا چاہیے ۔ کوئی راستہ چاہیے ۔ یوں جا کر پیسے پکڑا دینے سے کام نہیں چلتا ۔ بڑے بڑے چکر چلنا پڑتے ہیں ۔ کس کو کس صورت میں رقم پہنچائی جائے ! کچھ ایسے ہیں جو

تکلف کرتے ہیں۔ خود نہیں لیتے ۔ کہہ دیتے ہیں : بھئی میری بیوہ بہن ہیں ، بیٹیوں کی شادی کرنا ہے ۔ آپ جانتے ہیں میری آمدنی محدود ہے ۔ بس اتنا اشارہ کافی ہے ۔ ہم اُن کی بیوہ بہن کے پاس کپڑوں کے تھان ، زیورات کے سیٹ ، موٹرگاڑی ، جس کی بھی وہ بھولے سے فرمائش کر دیں ، پہنچا دیتے ہیں ۔‘‘

’’ اور جس کی بیوہ بہن نہ ہو ؟ ‘‘

’’ ایسا کوئی ہمیں تو آج تک ملا نہیں جس کے خاندان میں کوئی بیوہ یا یتیم نہ ہو ۔ بلکہ آج کل تو ایسا معلوم ہوتا ہے ان با رسوخ لوگوں کے یہاں پلٹنوں کی پلٹنیں یتیموں کی بھری پڑی ہیں ۔ شاید خود اُن کے بال بچے بھی یتیم ہی ہوتے ہیں ۔ ‘‘

’’ یہ لوگ پکڑے نہیں جاتے ؟‘‘

’’ کون پکڑے ؟ زانی کو پہلا پتھر مارنے کا حق تو وہی رکھتا ہے جس نے کبھی خود گناہ نہ کیا ہو ۔ ویسے ہم ایسا کچا کھیل نہیں کھیلتے ۔ لینے والے بھی کوئی اناڑی نہیں ۔ یوں سمجھو کہ ہر بڑے شہر میں جتنے بہترین ہوٹل ہیں وہاں میرا کھاتا کھلا ہؤا ہے ۔ مثلاً وہاں کوئی جائے اور کہے : کمرہ چاہیے ، اور اگر وہ اپنا نام ’’ گلاب چند‘‘ بتائے تو مینیجر بغیر پوچھے گچھے اسے میرے کھاتے میں کمرہ دے دے گا ۔ اب وہ چاہے جس بڑے بزاز یا

جوہری کو فون کریں ، حاضر ہو جائے گا اور '' گلاب چند '' کے نام سے جتنے مال کا فیصلہ ہو چکا ہو مل جائے گا ۔ نہ کوئی بل بنے گا ، نہ رسید لی جائے گی ۔ اب پکڑے سالہ کوئی ماں کا لال گلاب چند کو ۔''

'' کمال ہے !'' نیلوفر کی آنکھیں پھٹ گئیں ۔

'' اس کے علاوہ اور بھی طریقے ہیں لین دین کے ۔ ارے بھئی جب دوستی ہی ٹھیری تو میں چاہوں تو ان کی بہو کو منہ دکھائی میں موٹر دے دوں ، کوئی میرا کیا کرے گا ؟ راجہ ہوں ، کوئی ایسا ویسا کنگال تو ہوں نہیں کہ ایک ہیرے کا سیٹ نہ دے سکوں یا شادی کے انتظام میں ہاتھ نہ بٹا سکوں ۔ ڈیرے تنبو لگوادیے ، لائٹ کا انتظام کروا دیا ، موٹریں سپلائی کر دیں ، ہزار طریقے ہیں ۔ کوئی کیا کہا کے پکڑے گا ۔''

'' مگر بدلے میں کیا ملتا ہے ؟ ''

'' جس چیز کی ضرورت ہو ۔ مثلاً : کوئی ٹھیکہ ہے ۔ ڈسپوزل کا مال ہے ۔ کوئی زمین چاہیے ہے ۔ پچھلے دنوں ایک زمین پر بڑا مقابلہ ہو گیا ۔ وہاں گرلز اسکول ہے ۔ میں نے وہ زمین اس کے مالک سے خرید لی ۔ اب وہاں ایئر کنڈیشن سینما حال بنانے کا پلان ہے ۔ اسکول کے ٹرسٹیوں کو تو منا لیا ہے ، مگر وہ دوکوڑی کی ہیڈ مسٹرس فیل مچا

رہی ہے ۔''

'' پھر اب کیا کریں گے ؟ ''

'' دیکھتی جاؤ کیا کریں گے ۔ وہ ہیڈ مسٹرس کرسچین ہے ۔ بیس برس سے اسکول چلا رہی ہے ۔ بس اب یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ وہ کسی طرح ریٹائر ہو یا نکالی جائے، سو ممکن نہیں ۔''

'' کیوں ؟ ''

'' ابھی دس سال اور کام کر سکتی ہے ۔ دوسرے اس نے لڑکیوں کو ملا لیا ہے اپنی طرف ۔ سیدھی طرح اگر میری منت کرتی تو شاید نرم پڑ جاتا، مگر وہ تو اکڑ دکھانے لگی ۔ مجھے بھی ضد آ گئی ہے ۔ بمبئی چل کر ذرا ٹٹولنا پڑے گا ۔''

'' کہ مرغی گلی یا نہیں ؟ ''

'' ہاں ۔ '' راجہ صاحب ہنسنے لگے ۔

'' ادرک لہسن اچھی طرح لگایا ہے ؟ ''

'' کیا ؟ ''

'' مرغی گلانے کے لیے ۔''

'' اوہ ! ہاں ، اس کی تم فکر نہ کرو ۔ بس بمبئی چلو ۔ ذرا ایک زور دار پارٹی ہو جائے ۔ کیوں ؟ '' انہوں نے نیلوفر کے کولھے پر دھپ مار کر کہا ۔

" اوئی ! " نیلوفر کھلکھلانے لگی ۔ نہ جانے ایک دم اُس کی چھاتی کا بوجھ کہاں غایب ہو گیا ۔ آپ ہی آپ قہقہے اُبلنے لگے ، جیسے امتحانوں کا نتیجہ آ گیا ہو کہ وہ اچھے نمبروں سے پاس ہو گئی ۔ دوسروں کے تو اس سے بھی کم نمبر تھے اور بڑی بڑی ڈگریاں دبائے بیٹھے تھے ۔ وہ اتنی بری بھی نہیں ۔

اسی بات پر اُس نے خوب دل کھول کر پی اور بزنس کو بھول کر اُس نے راجہ صاحب کو جی بھر کر پیار کیا ۔ ایسے کہ وہ فلم ، جنھیں دیکھ کر اُسے قے ہو گئی تھی ، کچھ دھندلے پڑ گئے ۔

راجہ صاحب کی صحبت میں نیلوفر نے دنیا کے نئے نئے روپ دیکھے ۔ ہر روپ سیاہی میں ایک دوسرے سے بڑھ کر تھا ۔ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے گناہ کے سمندر میں وہ تو صرف ایک ننھی سی بوند ہے ۔ سب ہی اس سے کچھ کم ، کچھ زیادہ مجبور ہیں ۔ بڑی مستعدی سے خود اپنے پیروں میں ڈھال ڈھال کے بیڑیاں جکڑ رہے ہیں ۔ گناہ جب ضرورتِ زندگی کی صورت اختیار کر لے تو پھر گناہ نہیں عقل و دانش کا تقاضا بن جاتا ہے ۔ جس حمام میں سب ہی ننگے تھے وہاں آسے اپنے برہنہ پن سے کیوں تکلف محسوس ہوتا ۔ چند ہی مہینوں میں اُس نے اپنی قیمت کئی بار دگنی تگنی

ادا کر دی ۔ کلکتہ ، بمبئی ، مدراس ، دہلی ، غرض ہر بڑے ۔ شہر میں راجہ صاحب کی دعوتیں اور محفلیں کامیاب رہیں ۔

دہلی میں اسے ممی کا خط ملا ۔ وہ زبیدہ کے لیے لڑکا دیکھنے گئی تھیں ۔ زبیدہ بی ۔ اے کے آخری سال میں تھی ۔ انہوں نے کئی لڑکوں کے لیے سلسلہ جنبانی کی ۔ مختلف مانگیں ہیں آن کی ۔ جیسا گدھا ویسے دام ۔ زبیدہ کی شادی کے ذکر سے نہ جانے دل کے کس حساس کونے میں ٹھوکر سی لگی ۔ معصومہ نے ابھی دم نہیں توڑا تھا ۔ ابھی زندگی کی رمق باقی تھی ۔ کیا وہ اپنی بہن سے جل رہی تھی ؟ اس کی پاک صاف زندگی پر رشک آ رہا تھا ۔ قطعی نہیں ۔ آسے زبیدہ سے ہمیشہ سے محبت تھی ۔ وہ بھونڈی سی تھی ۔ پڑھنے کی شوقین تھی ۔ آسے پڑھا لکھا کر نیلوفر کو بڑا اطمینان ہوتا تھا ۔ کچھ اپنی زندگی کی محرومیوں کی تلافی ہو جاتی تھی ۔ آس نے ممی کو لکھ دیا کہ بے تکلف آونچے داموں کا مال زبیدہ کے لیے تلاش کریں ۔ کوئی کسر آٹھا رکھنے کی ضرورت نہیں ۔ خط لکھ کر آسے بڑا سکون محسوس ہؤا ۔ آس رات آس نے بڑے آونچے آونچے قہقہے لگائے اور بڑا ہنگامہ کیا ۔ راجہ صاحب بار بار آسے ٹہوکے دے رہے تھے ، کیونکہ وہ گوہرِ مقصود ، یعنی ایک نہایت ہی اہم ہستی پر توجہ دینے کی بجائے ایک شاعر صاحب کے پہلو

میں گھس رہی تھی ، جو چپکے چپکے اس کے کانوں میں غلیظ اشعار ٹپکا رہے تھے ۔ ایسے گوہرِ مقصود کی گنجی کھوپڑی اور چکنے گھیاں جیسے لنڈ منڈ چہرے سے آبکائی آ رہی تھی ۔ اُس کی آنکھیں اور ناک کی پھننگ ایسی سرخ ہو رہی تھی جیسے وہ ابھی رو کر آیا ہے یا کسی کو رونے جا رہا ہے ۔ ” ارے بھئی کرنل صاحب کو ذرا بوٹی کباب چکھاؤ ۔ دیکھو تو اُن کا گلاس خالی پڑا ہے ۔ ذرا کرنل صاحب کو لطیفہ تو سناؤ ۔ وہ باتھ روم کا ، جو تم نے اس دن سنایا تھا تو ہنستے ہنستے پیٹوں میں بل پڑ گئے تھے ۔“ وہ بار بار اُسے گھیر کر ڈربہ میں لے جانے کی کوشش کر رہے تھے ۔ کرنل صاحب سخت ٹائٹ ہو رہے تھے اور اس پر پلے پڑ رہے تھے ۔ زبردستی اُلٹا اس کی خاطر پر تلے ہوئے تھے ۔ اُس کے گلاس میں برف ڈالتے ہوئے نشانہ چوک گیا اور برف کی ڈلی نیلوفر کے کندھوں پر سے ڈھلکتے ہوئے گریبان میں جھونک دی ۔ نیلوفر کے چیخنے پر بوکھلا کر جو برف پکڑنے کے لیے ہاتھ ڈالا تو برف تو پھسل کر نیچے سے نکل گئی ، ہاتھ انگاروں پر پڑ گیا ۔ نشہ میں نیلوفر کو یاد نہیں اُس نے کیا ۔ کیا ۔ پوری محفل برف کے ٹکڑوں کی تلاش میں ہاتھ سینکنے لگی ۔

صبح جب آنکھ کھلی تو کسی اجنبی ہوٹل کا کمرہ

تھا ۔ پاس ھی تکیے پر سیمرغ کا انڈا رکھا تھا ۔ مگر بیچوں بیچ سے تڑخا ہؤا تھا ، جیسے اندر سے بچے نکلنے کے لیے کھٹکی لگائی ہو ۔ بڑی دیر تک اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ کس جنگل بیابان میں ھے ۔ مگر اتنے میں انڈا گھوما اور چھلی ہوئی اروی نے سونے منڈھے دانت نکوس دیے ۔

” اوہ ! “ اس نے آنکھوں پر ھاتھ رکھ لیے ۔

” مس جنگ مجھے بڑا افسوس ھے ۔ “

” آپ نے جان بوجھ کر مجھے اتنی پلائی تھی ۔“ اس نے ناٹک شروع کیا ، حالانکہ بیچارے نے قطعی نہیں پلائی تھی ۔ ” آپ ... آپ ۔“ وہ ھکلا کر رہ گئے ۔

” آئی وانٹ ٹو ڈائی ۔ “

” پلیز ۔ ڈارلنگ ۔ “

” مجھے ٹیکسی منگوا دیجیے ۔ “

” گاڑی موجود ھے ۔ مگر ... “

” آپ نے مجھے کیا سمجھا ھے ؟“ اس نے ران پر رینگتا ہؤا ھاتھ دور پھینکا ۔

” اوہ مائی گاڈ ۔ لسن پلیز ۔ “ حالانکہ کرنل صاحب سمجھتے تھے کہ وہ کون ھے ، مگر اس کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں ھتک محسوس ہوتی تھی ۔ کتنی طمانیت تھی اس احساس میں کہ انہوں نے ایک اونچی سوسائٹی کی مہذب لڑکی کو

خراب کیا ۔

"آئی ایم اے سوائن !" انہوں نے فخر سے سینہ پھلا لیا ۔

وہ اوندھی پڑ کر سسکیوں سے رونے لگی ۔ اسے خود تعجب ہو رہا تھا کہ بغیر آنکھ میں انگلی مارے آنسو خود بخود نکل آئے ۔ واقعی ھچکی بندھ گئی ۔ کیوں ؟ اسے سخت حیرت ہو رہی تھی ۔ کرنل صاحب نے اس کے پیروں پر سر رکھ دیا ، تب تو اسے ھنسی آجانا چاہئے تھی ، مگر کوئی قابو سے باہر ، زبردست طاقت اس کے وجود میں رو رہی تھی ۔ جب طوفان رک گیا اور بادل چھٹ گئے تو تازہ نیبو کا رس پیتے ہوئے اسے معلوم ہوا وہ اشوک ہوٹل میں ہے ۔ "مائی گاڈ ! کیا غصہ ہے ۔" کرنل صاحب نے پیار سے سر کی چوٹ کو سہلاتے ہوئے کہا ۔ میدانِ جنگ میں انہوں نے بڑے بڑے زخم کھائے تھے ۔ ان کی وردی تمغوں سے بھری پڑی تھی ۔ اتنا حسین زخم ، اتنی حسین محبوبہ نے شاید اس سے پہلے انہیں نہیں بخشا تھا ۔ جب ھی تو وہ میٹھی میٹھی آنکھوں سے اسے تک رہے تھے ۔ اور بجائے روٹھنے کے الٹے احسان مند نظر آرہے تھے ۔ دوسری جنگِ عظیم میں وہ میجر تو ضرور رہے ہوں گے ، کیونکہ نہ صرف ان کی کھوپڑی گنجی تھی بلکہ گدی پر بالوں کی جھالر بھی قریب

قریب سفید تھی - گالوں پر بھی چیونٹی کے انڈے پھوٹ رہے تھے -

نہ جانے کیوں نیلوفر آداس ہوگئی - اس کے نصیب میں یہ آترے ہوئے آم کیوں لکھے تھے ؟ کیا زندگی میں ایک بار بھی وہ جوان باھوں کے حلقے میں نہ جھوم سکے گی ؟ احمد بھائی سے لے کے کرنل صاحب تک ، سب ھی اس سے عمر میں دگنے یا ڈھائی گنے تھے - ایک دم آسے پونا کا ٹیکسی ڈرائیور یاد آگیا - وہ ضرور نوجوان ہو گا - کاش وہ اتنی مدھوش نہ ہوتی !

وہ ناشتے پر ھی تھے کہ راجہ صاحب آ گئے -

” آداب عرض ! کہیے حضور مزاج تو اچھے ھیں - آداب عرض —“ وہ بالکل چھوٹے دیور کی طرح نیلوفر سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگے - ” آپ لوگ تو پارٹی سے ایسے غایب ہوئے کہ ہم ڈھونڈتے ھی رہ گیے - پھر تو پارٹی ھی اُکھڑ گئی - اچھا ھمیں بے وقوف بنایا -“

وہ جا کر بالکنی میں کھڑی ہو گئی اور راجہ صاحب باتوں میں غرق ہو گئے - کچھ مشینوں کا ذکر ہو رہا تھا - نیلوفر کو یاد آیا کہ راجہ صاحب کا ایک کارخانہ ہے جہاں تالوں کے علاوہ موٹروں کے کچھ سپیئر پارٹ ، اسٹوو، ٹفن کیریر وغیرہ بنتے ھیں۔شاید کسی بڑے کانٹریکٹ

کی تاک میں ہیں ۔

نیچے لان پر آیائیں بچوں کو لیے ٹہل رہی تھیں ۔ ایک سانولی سی بچی کو دیکھ کر نہ جانے کیوں اُسے اپنی بیٹی یاد آ گئی ۔ کیا نام تھا اُس کی بیٹی کا ؟ بالکل ذہن سے اتر گیا ۔ جب وہ پیدا ہوئی تھی تو اُس نے سیٹھ کی بیٹیوں کے وزن پر اس کا نام اوشا رانی رکھنا چاہا تھا ۔ نہ جانے کیوں سیٹھ جی کھسیانے سے ہو گئے تھے ۔ وہ اس بچی کو شیلا رانی ، پشپارانی اور اندرا رانی کے سلسلے کی کڑی بنانے کو تیار نہیں تھے ۔

اب تو اس کا نام فیروزہ بانو رجسٹر کروا دیا گیا ۔ فیروزہ نام کی ایک لڑکی سے اُنہیں کم سنی میں عشق ہو گیا تھا ۔ لاہور چلی گئی تھی ۔ اب تو شاید نائکہ ہوگی ٹھسے والی ۔

نیلوفر کا جی کھٹا ہو گیا تھا ، اس لیے وہ ہمیشہ اُس کا نام بھول جاتی تھی ۔ اُسے اس بھونڈی سی بچی پر ترس آیا تھا جو بے کرایہ کے مہمان کی طرح نو مہینے زبردستی اس کی کوکھ میں رہی تھی ۔ اگر بیٹا ہوتا تو شاید سیٹھ اتنی جلدی نہ پتہ کاٹ دیتے ۔ اُس نے سیٹھ کو اپنے دل کا ایک کونہ دیا تھا ، مگر جب سے وہ خالی ہؤا تھا اجڑا محل ڈھنڈار پڑا تھا ، جیسے دل کی جگہ صرف خلا رہ گیا ہو ۔ نہیں وہ اب کسی کو ٹوٹا پھوٹا کونا بھی نہیں دے گی ۔

"ویسے لوکل مارکیٹ تو نہیں کے برابر ہے۔ اوپر سے ان حرام زادوں نے اپنا جال پھیلا رکھا ہے۔"

راجہ صاحب کاروباری باتیں سمجھا رہے تھے: "گھروں میں چھوٹی چھوٹی بھٹیاں لگا لی ہیں۔"

"مگر اس سے آپ کے کارخانے پر کیا اثر پڑتا ہوگا؟"

"نہیں صاحب، کافی اثر پڑتا ہے۔ یہ کانچ انڈسٹری اندر ہی اندر گھن کی طرح چاٹ جاتی ہے۔ کتنا مزدور کھپ جاتا ہے، آپ اندازہ نہیں لگا سکتے۔ چھوٹے چھوٹے دیسی اوزاروں سے تالوں کے پرزے وغیرہ گھسنے کا کام ہے، جو گھروں میں بیٹھنے والی عورتیں بھی دن میں گھر کے کام کاج سے وقت نکال کر کرلیتی ہیں۔ ان بھٹیوں میں پرزے ڈھلتے ہیں، پالش کرنے کے لیے لوگ لے جاتے ہیں۔ بڑی کم مزدوری میں کام چل جاتا ہے۔ ذرا غور کیجیے، کتنا مزدور کٹ جاتا ہے۔"

"آپ کو کیا لیبر کی کمی ہے؟"

"ایسی خاص آسانی بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ گھر بیٹھنے والی عورتیں کارخانوں میں نہیں جا سکتیں، اس لیے وہ تو ویسے ہی ہاتھ سے گئیں۔ دوسرے یہ چھوٹے کارخانوں والے انہیں اپنے قابو میں رکھتے ہیں۔ ہم سے بائیکاٹ کرا رکھا ہے۔ الٹی سیدھی باتیں کہہ کر ڈرا رکھا ہے کہ

- یہ لوگ تم سے مفت محنت لیں گے ۔ تمہاری سنوائی نہیں ہو گی ۔ پھر وہی پارٹ ٹائم کی لالچ ہے ۔ سارا دن حاضری دینے کی ضرورت نہیں ۔ ہم لیبر کو آرگنائز نہیں کر سکتے ۔ پابندی سے یہ لوگ بھڑکتے ہیں ۔ کیا بتاؤں آپ کو ، زہر بہت دور تک پھیلا ہؤا ہے ۔ یہ لوگ پھیری والوں کی طرح گھر گھر لالٹینیں ، چولھے اور تالے وغیرہ بیچتے پھرتے ہیں ۔ سڑکوں پر چھوٹی چھوٹی دکانیں لگا لیتے ہیں ۔ سارے مارکیٹ پر چھائے ہوئے ہیں ۔ اب ہم ان سالوں کا کیسے مقابلہ کریں ۔ کتنی دکانیں کھول سکتے ہیں ۔ مفت کی درد سری ہے اور پھر ہماری بڑی دکان پر مکھیاں بھنکتی ہیں ۔ یہ چھوٹی دکان والے ظاہر ہے سستی چیزیں بیچتے ہیں ۔''

'' خواہ آپ کے مقابلے میں کوڑا ہی ہوں ؟ ''

'' اور کیا — ان لوگوں میں اتنی عقل کہاں کہ مہنگی اور پائیدار چیز کی قدر کریں ۔ دس بار خریدنا پڑے پر سستی ہو ۔ عجیب ذہنیت ہے ۔ اس کے علاوہ جو ایک فرقے کے دل میں دوسرے فرقے کے خلاف بغض کا بیج بویا جاتا ہے ، مجھے تو اُس پر اعتراض ہے ۔''

'' کیا ردی مال بیچنے کے جرم میں ان لوگوں کو پکڑا نہیں جا سکتا ؟'' کرنل صاحب جائی لے کر بولے ۔
'' نہیں صاحب ، یہ بھی کر کے دیکھ لیا ۔ ان لوگوں کو

سرکاری لائسنس دے دیے گئے ہیں ۔ اور مال بھی ان کا برا نہیں ہوتا ۔ دراصل یہ وہی لوگ ہیں جو پہلے کارخانوں میں مستری کا کام کر چکے ہیں ۔''

'' یہ کارخانہ تو عرصے سے بند پڑا تھا ۔''

'' جی ہاں ۔ نواب صاحب سے میں نے خرید لیا ۔ سب کوڑا ہو گیا تھا ۔ میں نے اتنا سرمایہ جھونکا ہے کہ کچھ عرض نہیں کر سکتا ۔ تمام نئی مشینری لگوائی ۔ ٹرینڈ اسٹاف رکھا ۔ صاحب آخر ہمارے گزارے کا بھی تو کوئی انتظام ہونا چاہیے ۔ کیا ہم سے ریاستیں چھیننے کے بعد روزی بھی حلق سے نکال لینے کا ارادہ ہے ؟ ہم جہاں بھی سرمایہ لگاتے ہیں یہی مشکلیں آن پڑتی ہیں ۔ بالکل ہاتھ پیر باندھ دیے ہیں قانون نے ۔ پولیس بھی ان کا ہی ساتھ دیتی ہے ۔ اور پھر کہتے ہیں : سرمایہ نایاب ہے ۔ ہمارا کیا ہے صاحب ؟ ہماری بلا سے ۔ ہمارا روپیہ لاکر میں پڑا رہے ، محفوظ تو رہے گا ۔ ملک کی اتنی کے لیے لگاؤ تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ کنگال ہو جاؤ ۔ اگر کوئی فیصلہ نہ ہؤا تو میں یہ کارخانہ اونے پونے بیچ کے انگلینڈ مائیگریٹ کر جاؤں گا ۔ بلا سے ، دو نوالوں کا سہارا تو رہ جائے گا ۔''

'' ارے ہاں خوب یاد آیا ۔ وہ جو آپ نے یاٹ منگوایا تھا ، اُس کا کیا بنا ؟ ''

'' ہے ۔ کسی دن چلیے نا ، جنا میں سیر رہے۔ ذرا دیکھیے تو ، آپ کو پسند ہو تو ...''

'' نہیں صاحب میرے پاس اتنے پیسے ...''

'' کیسی باتیں کرتے ہیں ؟ آپ مجھ سے ایسی غیریت برتتے ہیں بھگوان قسم ! مجھے تو آس کا رنگ پسند بھی نہیں ۔''

'' رنگ تو بہت خوبصورت ہے ۔''

'' بس سبز رنگ مجھے راس نہیں آتا ۔ ویسے آپ کا لکی اسٹون کیا ہے ؟''

'' زمرد ہے ، آس کے ساتھ ہیرا بھی چل جاتا ہے ۔''

'' زمرد! یعنی کمال ہے ، سات پشتوں سے زمرد ہمارے ہاں راس نہیں آتا ۔ دیکھیے ایک عرض ہے ، اگر میری دل شکنی منظور نہیں تو ...''

'' نہیں بھئی ۔ یہ کیا کرتے ہیں آپ ؟'' کرنل صاحب ھنسنے لگے ۔

'' کرنل صاحب یہ نہ سمجھیے گا کہ میں ان چیزوں کو بھی حساب میں لگا لوں گا ۔ یہ تو میری آپ کی دوستی کی بات ہے ۔ ویسے صاحب میں لالچی نہیں ۔ قوم اور ملک کی خدمت کا شوق ہے ۔ ملک انڈسٹریلائیز ہوگا تو کیا صرف ہمارا فائدہ ہوگا ؟ ملک کی مجموعی دولت نہ بڑھے گی ؟ پھر کیا ہم اور آپ غیر ملکی ہیں ؟ ہمیں بھی گزارے کے لیے کچھ

تھوڑا بہت ملنا چاہیے۔ آپ جیسا شخص ، جس نے ساری زندگی ملک پر نچھاور کر دی ، اپنے خون سے اسے سینچا ، کیا اسے کوئی حق نہیں پہنچتا ؟ آپ کی قابلیت کا کوئی دوسرا ہوتا تو نہ جانے کہاں پہنچا ہوتا ۔ سالے دھنے جلاھے گورنر بنائے جا رہے ہیں ۔ کیا دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں ۔ لیکن آپ کو کیا ملا ؟ وہی بندھی ہوئی تنخواہ ! صاحب آج کل کسی شریف انسان کو گزارے کے لائق تنخواہ ملتی ہے ؟"

نیلوفر دنگ رہ گئی۔ راجہ صاحب کو اس نے زیادہ تر حکم چلاتے دیکھا تھا ، مسکہ لگاتے آج دیکھا ۔ کارخانے کی طرف سے واقعی بڑے فکر مند نظر آ رہے تھے کچھ دنوں سے ۔ وعدہ کیا تھا کہ میرا کام ہو جائے تو کارخانے کی آمدنی میں سے تمہیں ہیرے کا سیٹ خرید دوں گا ۔ زبیدہ کے جہیز کا کچھ تو انتظام کرنا پڑے گا ۔ دولہا کو جوڑے گھوڑے کے بیس ہزار سے کیا کم دینے ہوں گے ۔ پڑھا لکھا ، اونچے خاندان کا لڑکا اتنے میں مہنگا نہیں ۔

اس کا خیال تھا اب راجہ صاحب اسے ساتھ لیتے جائیں گے ۔

" ذرا ایک ضروری کام سے جانا ہے ، تم واپسی میں چلی چلنا ۔" انہوں نے آہستہ سے بالکنی میں جھانکنے کے بہانے پاس آ کر کہا ۔

'' میرے کپڑے سارے مسلے گئے ۔''

'' موٹر میں اٹیچی لیتا آیا ہوں ، ابھی بیرے کے ہاتھ بھیجتا ہوں ۔''

اٹیچی میں ضرورت کی ہر چیز نہایت سلیقے سے موجود تھی ۔

'' بڑا بد صورت ہے ۔'' نیلوفر نے شکایتاً راجہ صاحب سے کہا تھا ۔

'' اس میں میرا کوئی قصور نہیں جانِ من ۔ میں نے اس کا اس پوزیشن پر تقرر نہیں کیا ۔ اور بھئی میرا کام کروا دے تو مجھے تو حور کا بچہ معلوم ہونے لگے گا ۔''

قدرت کے کھیل دیکھیے کہ ایک دن جس معصومہ کو پیٹ کی خاطر نیلوفر بننا پڑا تھا وہی نیلوفر پھر سے چولا بدل کر معصومہ بن گئی ۔ کام نہ سہی ، نام تو بدلا ۔ اسے ایسا محسوس ہؤا جیسے کئی سیڑھیاں وہ واپس چڑھ آئی اور اگر حالات یونہی سازگار رہے تو وہ بہت جلد سچ مچ دوشیزہ بن جائے گی ۔ اس کا پھٹا ہؤا گریبان سل جائے گا اور آنکھوں کی حیا واپس لوٹ آئے گی ۔ کئی پارٹیوں میں بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ اس کی تصویریں بھی اخباروں میں چھپ چکی تھیں ۔ سب کے ناموں کے ساتھ معصومہ جنگ کا نام دیکھ کر اس کے دل میں اس نئی ہستی کے لیے بڑی عزت پیدا ہو گئی

تھی ۔ اس جیسی بہت سی سوسائٹی کی معزز خواتین ہیں جن کے بارے میں اوٹ پٹانگ قصے اڑتے رہتے ہیں ، مگر اس سے ان کے وقار میں کوئی کمی نہیں آتی ۔ درمیانہ طبقہ کا چھچھور پن یہاں اثر انداز نہیں ہوتا ۔ اگر کسی خاتون کی دوستی ہے تو لوگ اس سے خاصا مرعوب نظر آتے ہیں ۔ کرنل صاحب گو ریٹائر ہو چکے ہیں ، انہوں نے اپنا رشتہ نہیں توڑا ۔ بڑے اور اہم عہدے داروں سے گہرے مراسم ہیں ۔ کوئی اہم پارٹی ایسی نہیں ہوتی جہاں یہ چند معزز اصحاب نہ ہوں ۔ اور امید ہے کہ اگر اسی طرح وہ سرکار کی مخالفت میں لیکچر اور بیان دیتے رہے تو جلد ہی کسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر یا کسی ملک کے سفیر بنا دیے جائیں گے ۔ پچھلے الیکشن میں بھی وہ کھڑے ہوئے تھے ، مگر آخر میں انہوں نے اپنا نام ایک زبردست اور اونچی حیثیت کی پارٹی کے حق میں واپس لے لیا تھا ۔

'' مگر آپ تو کہتے ہیں الیکشن میں بہت روپیہ خرچ کرنا ہوتا ہے ۔'' اس نے راجہ صاحب سے پوچھا ۔

'' ہاں ۔ مگر انہیں سارا خرچ مل گیا ۔ بلکہ اوپر سے فائدہ بھی ہو گیا ۔ ووٹ پکڑنے کے لیے دو چار آسامیاں تو کھڑی کرنی ہی پڑتی ہیں ۔ پھر کسی بھی پارٹی سے معاملہ طے ہو جاتا ہے ۔ بہت لوگوں کا تو ذریعۂ آمدنی ہی یہ ہے ۔''

'' تو یہ جو لڑکے آپ نے بلائے ہیں یہ بھی الیکشن کے سلسلے میں بلائے ہیں ؟ ''

'' ہاں ۔ یہی سمجھو ۔''

'' اتنے لوگ ٹھیریں گے کہاں ؟''

'' اپنی کوٹھی کے علاوہ دو اور کوٹھیوں کا انتظام کر لیا ہے ۔ کھانے کا انتظام ڈیروں میں رہے گا ۔ برتن وغیرہ گنوا لیے ہیں ؟ ''

'' جی ہاں ۔ گلاسوں کی کمی پڑے گی ۔''

'' میں نے ان کا انتظام کر لیا ہے ۔''

نیلوفر ایک دم کچھ سوچنے لگی ۔

'' کیا سوچ رہی ہو ؟''

'' یہی کہ کچھ گڑ بڑ نہ ہو جائے ۔''

'' نہیں جی گڑبڑ نہیں ہوگی ۔ پولیس کا پکا انتظام ہے ۔''

'' ہاں ... مگر ....'' وہ چپ ہو گئی ۔

'' تمھیں تکلیف ہو رہی ہو تو بمبئی ہو آؤ ۔ تمھاری بہن کی شادی کب ہو رہی ہے ؟''

'' دسمبر میں ۔''

'' تو چلی جاؤ ۔ کچھ انتظام کرنا ہوگا ۔''

'' نہیں نہیں ۔ بھلا ایسے موقع پر کیسے جا سکتی ہوں ۔ یونہی مجھے خیال ہؤا ۔'' وہ تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولی ۔

'' کیا رسانیت سے نہیں ہو سکتا ؟''

'' سیدھی انگلی گھی نکلتا تو اس ھنگامے کا کیا مجھے شوق ہے ؟''

'' مگر کیسے گدھے ھیں یہ لوگ - ان کی سمجھ میں ھی نہیں آتا - آپ انہیں اپنے کارخانے میں نوکری دینے کو کہتے ھیں، پھر بھی نہیں مانتے - دماغ خراب ہؤا ہے کمبختوں کا -''

'' تو پھر تمہارے لیے سیٹ رزرو کراؤں ؟''

'' کیوں ؟ ارے نہیں - میں تو ...''

'' میرے خیال میں تم چلی ھی جاؤ -''

'' کیوں ؟ کیا کچھ ھنگامے کا ڈر ہے ؟''

'' نہیں نہیں - ھنگامہ ھوگا بھی تو تمہارا بال بھی بیکا نہ ھوگا - میں سوچ رھا ھوں میں بھی چلا چلوں - کیوں منشی جی آپ کو تکلیف تو ھوگی نہ ؟''

'' نہیں سرکار - آخر تین پشتوں سے نمک جو کھایا ہے - اگر میری کھال کی جوتیاں بنا کر بھی حضور پہن لیں تو میری خوش قسمتی ھوگی -''

'' پھر بھی بال بچوں والے آدمی ھو -''

'' حضور میں نے سب کو سیتا پور بھیج دیا ہے - آپ کسی قسم کی فکر نہ کریں - ان سالوں کی بساط ھی کیا ہے ؟ بھوسہ بھر دیں گے جی -''

" بھئی خون خرابے سے ڈر لگتا ہے ۔ انہیں سمجھایا نہیں جا سکتا ؟ "

" بہت سمجھایا بائی جی ۔ سالے کہتے ہیں سب کو نوکریاں دو ۔"

" کیا مطلب ؟"

" مطلب یہ کہ جتنے کاریگر ، جو مستقل ان کے ساتھ لگے ہوئے ہیں ، انہیں بھی نوکری دو اور وہ جو پارٹ ٹائم کام کرتے ہیں انہیں بھی ۔ سالے گھنے گھنائے بڈھے بڑھیاں بھی ساتھ میں چپکے ہوئے ہیں ۔ کہتے ہیں ان کی روزی ماری جائے گی ۔ یہ کہاں جائیں گے ۔ کہو: بھئی کیا ہم نے ساری دنیا کا ٹھیکہ لیا ہے ؟ ہم نے کارخانہ کھولا ہے یتیم خانہ نہیں کھولا ۔ ذرا سوچیے اس طرح ملک انڈسٹریلائیز ہو سکتا ہے ؟

" یہ نیتا لوگ کچھ نہیں کرتے ؟ " نیلوفر نے بڑ ھانکی ۔

" ارے بھلی چلائی ان نیتاؤں کی ۔ اپنی بھٹی جھونکنے سے فرصت ملے تو دوسروں کی مشکلات پر نظر پڑے ۔ اندھا بانٹے ریوڑیاں ، اپنوں ھی اپنوں کو دے ۔ ساری رعایتیں ہیں تو پہلے اپنے کنبے کے لیے ، پھر اپنے صوبے والوں کے لیے ، بچتا کیا خاک ہے جو ہمارے ھاتھ آئے ۔ پھر دنیا بھر میں سرخ رو بھی تو بننا ہے کہ بڑا جنتا کا پالن ہو رہا ہے ۔

سوائے ہمارے سب کوڑا کرکٹ زندہ رہنے کا حق رکھتا ہے ۔ کہو : ہمیں مار کے تمہیں کیا مل گیا اور آئندہ کیا مل جائے گا ؟ کوئی منچلے اٹھے ، اسمبلی میں داغ دیا کہ کاٹج انڈسٹری کو ترقی دو ۔''

'' کہاں ہے صاحب !'' منشی جی بولے ۔

'' جی ہاں ۔ انہیں لون دینے کی اسکیمیں بن رہی ہیں ۔ مطلب یہ کہ بجائے اس کے کہ گھاس بکرے کو ملے ، بکرا کاٹ کر گھاس کو کھلا دیا جائے ۔ منشی جی آپ ٹکٹوں کا انتظام کیجیے ۔''

نیلوفر کی سمجھ میں اور کچھ نہیں مگر اتنی بات تو آ گئی کہ وہ لوگ ، جو راجہ صاحب کے کارخانے کی ترقی میں حائل ہیں ، ملک اور قوم کی ترقی کے دشمن ہیں ؛ راجہ صاحب کے دشمن نیلوفر کے دشمن ہیں ؛ اس چندن ہار کے دشمن ہیں جو کامیابی اور خوش اسلوبی سے کام ہو جانے کی صورت میں راجہ صاحب اسے دینے والے ہیں ؛ وہ چاہتے ہیں زبیدہ کو اچھا بر نہ ملے ، وہ بھی نیلوفر کی طرح برباد ہو ؛ سارا خاندان تباہی کے غار میں ڈوب جائے !

'' کوئی کسر اٹھا نہ رکھنا ۔'' اس نے راجہ صاحب کو اپنے عملے کو احکامات جاری کرتے سن کر اطمینان کا سانس لیا ۔

اب زبیدہ کی شادی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جائے گی - تاج میں بوفے ڈنر، اسٹیڈیم میں ریسپشن — ایک دفعہ دولھا والوں کی آنکھیں تو پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی -

'' آپ اطمینان سے بمبئی پدھاریے سرکار - مگر وہ لوگ کل تک بے مینٹ کرنے کو کہتے ہیں - پھر پرسوں بینک بند ہوگا -''

'' کل تمام بےمینٹ ہو جانے چاہییں - عین وقت پر کوئی اڑچن نہ پڑے - معاملہ نازک ہے، ذرا سی بھی لا پروائی ہو گئی تو سب کیے دھرے پر پانی پھر جائے گا -''

'' دلی موٹر سے جائیں گے سرکار ؟''

'' ہاں - میرا یہاں نہ رہنا ہی ٹھیک رہے گا - جو کچھ ہو میری غیر حاضری میں ہونا چاہیے -''

'' جی ہاں سرکار - اگر آپ ہوتے تو مجال تھی جو کچھ ہو جاتا -'' منشی جی شرارت سے مسکرائے -

'' روپیہ لاکر سے آج ہی نکلوا لیں گے - ایسے موقعوں پر کوئی فیکٹری کے کام کے لیے بھی چیک نہیں تڑانا چاہیے - تفتیش کے وقت یہ لوگ ذرا ذرا سی باتوں پر پریشان کرتے ہیں - ویسے میں نے سب ہی کو خوش کر دیا ہے - ہم اشوکا میں ٹھیریں گے - اگر ادھر ادھر کہیں دعوت میں ہوئے تو ہمیں اطلاع پہنچ جائے گی -''

'' جی ہاں حضور : ' گلاب کی قلمیں پھل گئیں !' ''
منشی جی مسکرائے۔

'' اور اگر کچھ گڑبڑ ہو جائے تو ؟''

'' ' قلمیں سوکھ گئیں ۔' حضور ذرا بھی ڈھیل ہو جائے تو جو چور کی سزا سو غلام کی۔ آ ... وہ ... میں ...'' منشی جی مؤدب انداز میں فکر مند ہو گئے۔''

'' ہاں ہاں کہو۔ تمہارے گھر کا روپیہ ادا ہو گیا؟''

'' جی وہ تو آپ کی عنایت سے ہو گیا۔ میرے بال بچے حضور کے اقبال کو دعائیں دیں گے ساری عمر۔ وہ آپ کی کنیز کی رخصت ہے۔ بس دو منٹ کے لیے تشریف لے آتے تو میری عزت کو چار چاند لگ جاتے۔''

'' تم جانتے ہو ہم اتنی جلدی واپس نہیں لوٹ سکتے۔ جوہری صاحب کو ہم دہلی سے ہدایات دے دیں گے ، وہ سیٹ بھیج دیں گے۔''

'' حضور ہم غریبوں کے ہاں جہیز میں وہ سیٹ تو جیسے ٹاٹ میں زربفت کا پیوند معلوم ہوگا۔ ویسے شادی اگر دھوم دھام سے نہیں بس سیدھی سادی طرح نمٹ جائے تو...''

'' تم کیش چاہتے ہو ؟ اچھا ہو جائے گا اس کا بھی انتظام۔''

جب منشی جی دعائیں دیتے رخصت ہو گئے تو راجہ

واحاصب بولے : '' ایک حرامی ہے۔''

'' کون ؟'' نیلوفر چونک پڑی ۔

'' یہی منشی کا بچہ ۔ کیش چاہیے ۔ بھروسہ نہیں ہمارے اوپر۔''

'' اور آپ ہیں کہ اس کے ذمے اتنا اہم کام سونپے دے رہے ہیں ۔ نکال باہر کیوں نہیں کرتے سؤر کو ؟''

'' تم نہیں سمجھتیں معصومہ بی بی ۔ ' اہم ' کاموں کے لیے حرامزادوں ہی کی ضرورت پڑتی ہے ۔ اچھا آج ذرا ہو جائے ۔ تم اپنا وہ جوڑا پہنو — وہ بنفشی والا ۔ آج ہم بڑے مزے میں ہیں ۔''

انہوں نے کچھ اس انداز میں کہا کہ نیلوفر کو معلوم ہؤا وہ ایک رنڈی ہے ۔

'' اُنہہ ، چولھے میں جائے !''اُس نے سوچا ۔ نہ جانے وہ کسے چولھے میں جھونک رہی تھی ۔ آن گلاب کی قلموں کو جو لگائی جانے والی تھیں، معصومہ بی بی کو یا ساری کائنات کو؟

ساری رات قوالی کی محفل جمی رہی ۔ شہر کے عمائدین جمع تھے ۔ پچھلے کمرے میں نائے و نوش کا بھی انتظام تھا ۔ بڑے بڑے افسر، قومی رہنما، شاعر ، ادیب جھوم جھوم کر داد دیتے رہے ۔ ایک طرف پردہ دار بیویوں کے لیے چقیں پڑی تھیں ۔ نیلوفر بنفشہ کے تر و تازہ پھول کی طرح اندر

باہر ہوسٹس بنی پھر رہی تھیں ۔ بیویاں آپس میں کھسر پھسر کر رہی تھیں :

'' دلی کی نوبہار کی بیٹی ہے ۔''

'' بمبئی میں فلم ایکٹرس ہے ۔''

'' نہیں جی بڑے آونچے گھرانے کی لڑکی ہے، آوارہ ہوگئی۔ راجہ صاحب پر دل آ گیا ، گھر بار چھوڑ کر بھاگ آئی ۔''

بیویاں کھسر پھسر کرتیں، مگر نیلوفر کو قریب آتے دیکھ کر کہنے لگتیں :

'' اے بہن آپ تو یکساں گھوم رہی ہیں ۔ بڑی تکلیف ہوئی آپ کو ۔''

نیلوفر چنا ہؤا شفون کا دوپٹہ ایڑیوں سے گھکرتی ، کہنیوں تک ڈھیلی کارگے کی آستین سنبھالتی دم بھر کو بہنوں کے جھمگٹے میں بیٹھتی ، پھر اٹھ کھڑی ہوتی ۔

'' بہن ذرا گلوریاں بھجوا دوں ، ابھی حاضر ہوئی ۔'' اور وہ پھر محفل میں جا بیٹھتی ۔

فارسی اور اردو کی قوالیوں پر سامعین سر دھن رہے تھے۔ راجہ صاحب کو شعر و ادب سے عشق تھا ۔ محفل ختم ہوتے ہی وہ کار سے روانہ ہونے والے تھےاور بار بار یاد دلا رہے تھے۔

نیلوفر جو سوڈا دیکھنے پچھلے کمرے میں گئی تو اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا ۔ پچھلی طرف لان پر کوئی پچاس

سائڈ سٹنڈے مع سامان کے لاریوں سے اتر رہے تھے ۔ منشی جی انہیں چھولداریوں میں لے جا رہے تھے ، مگر ان میں سے زیادہ تر ادھر کمرے کی طرف متوجہ تھے ۔ '' ادھر آئیے ۔ آپ کے لیے اس چھولداری میں سارا انتظام ہے ۔'' وہ انہیں سب سے الگ چھولداری میں لے گئے، جہاں مالی سوڈے کی بوتلوں کا بکس لے جا رہا تھا ۔

'' یہ چھولداریوں میں کون لوگ ٹھیرائے جا رہے ہیں ؟'' اس نے راجہ صاحب کو قوام کی گولی دیتے ہوئے پوچھا۔

'' ودیارتھی ہیں ۔ آگرے سے تاج محل دیکھ کر لوٹ رہے تھے ، منشی جی نے کہا انہیں ایک رات ٹھیر لینے دیا جائے ۔''

'' اے ہے کمبخت ڈاکو لگ رہے ہیں بالکل ۔''

'' اور میں کون لگ رہا ہوں ؟ میں بھی تو حسن کا ڈاکو ہوں ۔ قسم سے آج غضب کا نکھار ہے ۔'' راجہ صاحب نے شرارت سے اس کی چھنگلی میں چٹکی لی ۔

کوئی ڈھائی تین بجے مہمان رخصت ہوئے ۔ ابھی کچھ لوگ جا ہی رہے تھے کہ راجہ صاحب مع نیلوفر اور چپڑاسی کے اسٹیشن ویگن میں سوار ہو کر روانہ ہو گئے ، تاکہ سند رہے کہ وہ تو پہلے ہی چل دیے تھے ۔

نیلوفر نے اپنا تھکا ہؤا سر سیٹ کی گدی پر ٹکا دیا اور

آنکھیں بند کر لیں ۔

''ارے بھئی سونے کی شرط نہیں ۔'' راجہ صاحب نے بٹن دبایا ۔ سامنے کی سیٹ میں چھوٹی سی بار کھل گئی ۔ ''بھئی بہت تھک گئے ۔'' وہ نیلوفر کی گود میں نیم دراز ہو گئے ۔

پانچواں باب

وہ رو رہی ہے - ہولے ہولے خاموشی سے رو رہی ہے - اس کا چہرہ اندھیرے میں کھویا ہؤا ہے - سر جھکا ہؤا ہے اور کوئی نہیں جان سکتا کہ وہ رو رہی ہے ، ڈر رہی ہے، کیوں کہ اس کے رخساروں پر بہنے والے آنسوؤں میں ستاروں کی جوت نہیں ، جو اتنے کالے ، اتنے دبیز اندھیرے میں چمک سکیں - کوئی آرہا ہے - اس کے پیچھے - دبے پاؤں - کوئی غیر مرئی ہیولا - بجبجاتا ہؤا عفونت کا ڈھیلا ڈھیلا سیاہ انبار - ان دیکھا ، ان جانا - بس ایک ہی جست میں آسے دبوچ لے گا - وہ جا رہی ہے - جا رہی ہے - ایک سنسان سڑک پر اکیلی روتی جا رہی ہے - درندے کے لمبے لمبے دھار دار دانت خون میں لتھڑے ہوئے ہیں - یہ ان لوگوں کا خون ہے جو اس راہ پر نیلوفر کی طرح تن تنہا گزرے ہیں -

آس کی چینی کی گڑیا ٹوٹ گئی ہے - وہ ہچکیوں سے رو رہی ہے - چپ چاپ اندھیرے میں تنہا رو رہی ہے - فضا میں گلے سڑے گوشت اور داغدار چمڑے کی بوجھل بو ہے ، جیسے گرم تپتے ہوئے لوہے کو تازہ تازہ خون میں بجھا دیا ہو - کانچ کے ذرے آس کے ناخون سے آترتے ہوئے دل تک

رینگ رہے ہیں ۔ دماغ میں باریک باریک قینچیاں چل رہی ہیں ، جیسے کوئی افشاں کتر رہا ہو ۔ اور افشاں کا ہر ذرہ نشتر بن کر مانگ میں گھس رہا ہے ۔ کوئی دم میں اُس کی ہستی کرچی کرچی ہو جائے گی ۔ د رندہ چلا آ رہا ہے ۔ اُس کے پنجوں کے چٹخنے کی آواز دور بدلی میں چھپے بادلوں کی طرح کڑک رہی ہے ۔ اس کے پیر من من بھر کے ہو گئے ۔ ٹوٹی ہوئی گڑیا ہتھیلیوں میں چبھنے لگی ۔ آخری سیڑھی سے آگے نا معلوم خلا بگولے کی طرح اُٹھے اور اُسے دبوچنے لگے ۔ اپنے جی کا زور لگا کر وہ چیخی ، مگر فضا خاموش رہی ۔

اُس نے دیکھا کہ وہ ایک زریں قبر میں بند ہے ۔ آبنوس کا کفن اُسے اپنے شکنجے میں جکڑے آہستہ آہستہ سکڑ کر تنگ ہوتا جا رہا ہے ۔ زر بفت ، کمخواب اور شفون کے تھان اُس کے پھیپھڑوں میں ٹھنستے چلے جا رہے ہیں ۔ جگمگ کرتے جواہرات اُس کے گوشت میں کنکھجورے کی طرح ہولے ہولے دھنس رہے ہیں ۔ پکھراج پیپ کی طرح رس رہا ہے ۔ یاقوت چھلے زخم کی طرح بہہ رہے ہیں ۔ موتی سفید کیڑوں کی طرح اُس کے جسم پر سرک رہے ہیں ۔

سانس گئی ۔ اب لوٹ کر نہیں آئے گی ۔ یہ آخری سانس تھی ۔ ایک زخمی سسکی کے ساتھ اُس کی آنکھ کھل گئی ۔

منہ کھلا رہ جانے سے اُس کا تالو خشک ہو گیا تھا ۔ زبان جوتے کے تلے کی طرح سن اور کھردری ہو رہی تھی ۔ جسم پسینے میں ڈوبا ہؤا تھا ۔ مریض کتیا کی طرح وہ کراہتی کانکھتی اُٹھ بیٹھی ۔

جب پتلیاں ایک نکتے پر پڑیں تو اُس نے دیکھا وہ ایک نہایت شاندار کمرے میں ڈبل بیڈ پر پڑی لرز رہی ہے ۔ پہلو کا تکیہ خالی ہے ، مگر کسی کے سر کا نشان دیکھ کر اندازہ ہؤا کہ وہ رات تنہا نہیں رہی ۔ تھوڑی دیر تک تو اُسے یاد نہ آیا کہ کس کے سر کے بوجھ سے تکیہ دھنساہؤا ہے ۔ وہ بالکل بھول گئی تھی کہ آج وہ کس کے ساتھ ہے ۔

پھر ادھر اُدھر بکھرے ہوئے لباس سے اُسے یاد آیا کہ وہ راجہ صاحب کے ساتھ رات کو موٹر میں روانہ ہوئی تھی ۔ راستے میں دونوں بد مست ہو گئے تھے ۔ نہ جانے کمرے تک وہ کیوں کر پہنچی ۔ راجہ صاحب ہی لائے یا اُنھوں نے کسی دوست کو اُسے اُدھار دے دیا ۔ یا پونا کی طرح ڈرائیور کو بخش گئے ۔ ایک دم اکیلے پن سے ڈر کر وہ کانپنے لگی ۔ غسل خانے میں پانی گرنے کی آواز پر وہ چونکی اور جلدی سے اُٹھ کر بھاگی ۔

پہلے تو وہ سمجھی کوئی پیلے رنگ کا بڑا سا مینڈک ٹب میں کود پڑا ہے ، مگر فوراً ہی وہ راجہ صاحب کو

پہچان گئی ۔ اور ایک دم سے تنی ہوئی طنابیں ڈھیلی پڑ گئیں ۔ وہ وہیں اکڑوں بیٹھ کر ہنسنے لگی ۔

" ارے تم جاگ اٹھیں ۔ "

وہ ہنسے گئی ، جیسے کھوئی ہوئی کنجی مل جائے ۔ یہ پہلی پہلی حسین دروازے کی کنجی !

" ارے... کیوں ہنس رہی ہو ؟" راجہ صاحب ہنسے۔

" اوہ !" وہ پیٹ پکڑ کر جھک گئی ۔

" ذرا ہماری پیٹھ مل دو ۔ " پیٹھ ملتے وقت اس نے زندگی میں پہلی بار راجہ صاحب کو دیکھا ۔ وہ ہمیشہ اتنا پیے ہوتی تھی کہ غور ہی نہیں کیا کہ ان کے کندھے ڈھلکے ہوئے ہیں اور ٹانگیں بہت ٹھگنی ہیں ۔ کپڑے پہن کر وہ بالکل بدل جاتے ہیں ، اتنے بھونڈے نہیں لگتے ۔

مگر اتنے میں راجہ صاحب کو شرارت سوجھی اور اسے ٹب میں گرا لیا اور دونوں بچوں کی طرح چھلیں کرنے لگے کہ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی ۔ ہاتھ بڑھا کر راجہ صاحب نے ٹیلی فون اٹھا لیا ۔

" گلاب کی قلمیں لگ گئیں ۔" راجہ صاحب نے آہستہ سے ٹیلی فون رکھ دیا اور بڑے پیار سے نیلوفر کے سر پر صابن ملنے لگے ۔ مزے مزے سے نہا کر دونوں نے کمرے ہی میں ناشتہ کیا ۔

'' تم تیار ہو جاؤ تو بازار چلیں ۔''

'' تھکن آ رہی ہے ، شام کو چلیں گے ۔''

'' شام کو کہیں اور جانا ہے ۔ اچھا کہو تو یہیں ساڑھیاں اور زیورات منگوا لیں ۔''

'' نہیں وہ پرانی سڑی چیزیں اٹھا لائیں گے ۔ اچکن کے لیے کمخواب بھی دیکھنا ہے ۔ کس دکان کا ذکر کر رہے تھے آپ ؟ ''

مگر نیلوفر نے دیکھا وہ کچھ سن نہیں رہے ہیں ۔ بار بار سگریٹ سلگاتے ہیں اور پوری کی پوری ایک کش لے کر پھینک دیتے ہیں ۔ وہ یونہی اخبار اٹھانے لگی تا کہ دیکھے شاید کوئی نیا انگلش فلم چل رہا ہو ، تو جلدی سے انہوں نے اس کے ہاتھ سے اخبار لے لیے ۔

'' بس جلدی تیار ہو جاؤ ، گیارہ بج چکے ہیں ۔''

نیلوفر نے ساریڈون کی ایک گولی حلق سے اتاری اور مرے دل سے تیار ہونے لگی ۔ شاید خواب کی وجہ سے دل بجھا بجھا سا ہو رہا تھا ۔

راجہ صاحب نے خزانے کا منہ کھول دیا اور اس نے جی بھر کے ساڑھیاں خریدیں ۔ ڈنر سیٹ ، کٹلری اور چائے کا سیٹ براہِ راست بمبئی بھجوانے کا آرڈر دیا ۔

'' ارے صاحب اندھیر ہو گیا ۔'' دکان دار ایک دم

سے راجہ صاحب سے کہنے لگا ۔

'' کمخواب کے وہ دونوں تھان بھی رکھ دیجیے ، جو پسند آئے گا وہ لے لیا جائے گا ۔'' راجہ صاحب نے بات کاٹی ۔

'' کیسا اندھیر ؟ '' نیلوفر نے پوچھا ۔

'' کچھ نہیں بیگم صاحب ۔ وہ ... وہ ٹیکس اور بڑھا دیا بنارسی کپڑے پر ۔'' دکان دار نے فوراً بات پلٹی ۔

نیلوفر ایک آتشیں رنگ کی ساڑھی پر ایسی لٹو ہوئی کہ اس نے راجہ صاحب اور دکان دار کو قطعی فراموش کر دیا اور آئینے میں کندھے پر ساڑھی پھیلا کر دیکھنے لگی ۔

''بھئی شام کو یہی پہن کے چلنا ۔'' راجہ صاحب مسکرائے ۔

'' اُنہہ ! لعنت ! ہم نہیں جائیں گے اس سؤر کے ہاں ۔''

'' ارے کیوں بے چارے کو مارتی ہو بے موت ۔ صبح سے دو دفعہ ٹیلی فون کر چکا ہے ۔''

'' نفرت ہے اس کرنل کے بچے سے ۔''

جوھری کے ہاں جاتے وقت انہوں نے راستے میں سو کمبل ، مٹھائیوں کے ٹوکرے ، بسکٹوں کے پیکٹ اور پھل وغیرہ خریدے ۔

'' یہ سامان کیوں خرید رہے ہیں ؟''

'' اناتھ آشرم میں بانٹنا ہیں ۔'' یہ کہہ کر انہوں نے وہیں سے پانچ چھ جگہ ٹیلی فون کیے ۔

اچھا ! جب ہی راجہ صاحب مصر تھے کہ سادہ ململ

کی ساڑھی پہنو ۔ خود بھی کھدر کا چوڑی دار پاجامہ اور کرتا پہن رکھا تھا ۔

یتیم خانے میں اخباروں کے نمائندے اور فوٹوگرافر موجود تھے ۔ بچے صاف کپڑوں میں کٹھ پتلیوں کی طرح بھونچکے کھڑے ہوئے تھے ۔ راجہ صاحب نے بچوں کو مٹھائیاں دیتے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تصویریں کھچوائیں ۔ نیلوفر نے بڑے پوز مار کر کمبل اور سویٹر دے ۔ اسے چاروں طرف سے اخبارچیوں اور فوٹوگرافروں نے نرغے میں لے کر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی :

” بمبئی کے کس علاقے میں آپ سوشل ورک کرتی ہیں ؟“

اس کا جی چاہا کہہ دے : ” اے روڈ پر ! “ مگر راجہ صاحب آڑے آ گئے :

” کوئی خاص علاقہ مخصوص نہیں ۔ بس جنرل ورک کرلیتی ہیں ۔“

” آپ وہاں پیشہ ورعورتوں میں کام کیوں نہیں کرتیں ؟“

نیلوفر کا جی چاہا زور کا قہقہہ لگائے ۔

” وہیں تو کام کرتی ہوں ۔“ اس نے ڈھٹائی سے کہا ۔

” جی ہاں پون پل اور فارس روڈ ۔“ راجہ صاحب نے اس کے بازو میں کہنی مار کر جلدی سے لگام اپنے ہاتھوں میں تھام لی ۔

" کس قدر شرم کی بات ہے کہ ہم لوگ آزاد ہو گئے لیکن پھر بھی اس بے شرمی کے پیشے کا انسداد نہیں ہؤا ۔"
اس نے بڑی سنجیدگی سے اخبار کا پڑھا ہؤا جملہ دہرایا ۔

اناتھ آشرم کے دو چھوٹے چھوٹے بچوں نے ہار پھول پہنائے اور مہتمم صاحب نے راجہ صاحب کی شان میں ایک لمبا چوڑا قصیدہ پڑھا ۔ ان کی فیاضی ، دریا دلی اور کسر نفسی پر روشنی ڈالی ۔ پھر ان کے وہ تمام احسانات گنائے جن کے بوجھ سے انسانیت کی کمر دہری ہو چکی تھی ۔ نیلوفر سے انہوں نے کہا :

" ہمارے دھن بھاگ ہیں کہ آپ جیسی دیوی کے درشن پراپت ہوئے ۔ ہماری قوم اور ملک کو آپ ہی جیسی مہان دیویاں کلیان کر سکتی ہیں ۔"

نیلوفر کے حلق میں قہقہہ گدگدانے لگا ۔ اس کا جی چاہا کہہ دے :

" آلو کے پٹھے کیا تیری ماں بہنیں بھی ملک کی اسی طرح سیوا کرتی ہیں ؟"

واپسی پر راجہ صاحب بہت مگن تھے ۔

" بھئی واہ جنو ، تم نے تو زور باندھ دیا ۔ یہ سب اس سفید ساڑھی کا چمتکار تھا ۔ بالکل دیوداسی لگ رہی تھیں ۔ ارے تم مجھ سے لڑو جھگڑو نہیں تو سچ کہتا ہوں چناؤ میں

کھڑا کر دوں ۔''

'' اے ہٹیے بھی ۔ مجھے تو وحشت ہو رہی تھی ۔''

'' ارے سب وحشت ختم ہو جائے گی ہولے ہولے ۔''

'' آج کرنل کی دعوت گول کر جائیں ؟'' اس نے راجہ صاحب کا موڈ دیکھ کر کہا ۔

'' نہیں جی خوا مخواہ اکڑ جائے گا ۔ بڑا بد ہے منحوس۔''

'' مگر آپ تو کہہ رہے تھے خون خرابہ نہیں ہوگا ۔'' نیلوفر نے قریب قریب چیخ کر کہا اور اخبار کو دونوں ہاتھوں سے کھسوٹنے لگی ۔

'' میرا تو سارا پلان لوٹ پوٹ ہو گیا ۔''

'' جھوٹ!'' وہ اخبار میز پر بچھا کر ، اس پر دونوں مٹھیاں مار مار کر چیخی : '' یہ دیکھیے !''

'' اچھا زیادہ بک بک نہ کرو ۔ اُٹھو تیار ہو جاؤ ۔ وہی گلابی ساڑھی پہننا ، تم پر خوب کھلتی ہے ۔''

'' خاک پڑے کپڑوں پر ۔''

'' تو کیا مطلب تمہارا ؟ کیا غنڈے میرے کارخانے کو آگ دیتے تب ہی تمہیں خوشی ہوتی ؟''

'' کون سے غنڈے ؟''

'' وہی جو میرے دشمن ہیں ۔ جن کی وجہ سے میرا کارخانہ بیٹھا جا رہا ہے ۔''

" وہ موئے ذوکوڑی کے مستری، بھلا ان کی اتنی بساط تھی کہ آپ کا کچھ بگاڑ لیتے ؟ "

" کیا عقل مند ہو جی ۔ تمھیں نہیں معلوم وہ میرے کارخانے کے لیے موت کا سندیسہ بنے ہوئے تھے ۔ ان کے بنائے ہوئے پرزے سستے بھی ہوتے تھے اور بہتر بھی ہوتے تھے ۔ وہی لوگ تو آگ لگانے چڑھ دوڑے تھے ۔ کیا مرضی ہے تمھاری، منشی انہیں کارخانہ بھسم کر لینے دیتا ؟"

" تو پھر یہ کالج کے لڑکے کیوں لپیٹ میں آ گئے ؟"

" آنہہ ، یہ لڑکے تو بدمعاش ہوتے ہی ہیں ۔ سنتے ہیں کہ کالج کے کسی لڑکے کو چار پانچ اسٹوڈینٹس نے پیٹ دیا ۔ دوسرے فرقے کے ودیارتھیوں کو جو خبر ملی تو وہ بھی بھنا اٹھے ۔ آخر وہ اپنے ساتھیوں کو پٹتا دیکھ کر کیسے خاموش رہتے ؟ بس اتنی سی بات کو لے کر اچھال رہے ہیں یہ اخبار والے ۔"

" اور پولیس ؟"

" بس ذرا دیر سے پہنچی ۔ اتنی دیر میں لوگ آگ لگا چکے تھے ۔ معاملہ قابو سے باہر ہو گیا ۔ یہ سب ان کالج کے لونڈوں کی بد ذاتی کا نتیجہ ہے ۔ معاف کرنا یہ لوگ تو بات بات پر غنڈہ گردی پر تل جاتے ہیں ۔ ان کی ذہنیت ہی دنگے فساد کی ہے ۔"

’’ نہیں یہ بات نہیں۔ بازار میں لوگ کہہ رہے تھے کہ باہر سے غنڈے بلا کر عمداً بلوہ کرایا گیا ہے ۔ پہلے سے ساری تیاریاں کرلی تھیں ۔ چاقوؤں اور ایسڈ کے بموں سے حملہ کیا گیا ۔‘‘

’’ کیا بکواس بازار میں سے سن آئیں اور میرا بھیجا چاٹ رہی ہو ۔‘‘

’’ مگر وہ جو رات کو لاریوں میں سے اُتر رہے تھے ، مجھے تو غنڈے لگ رہے تھے ۔‘‘

’’ تمہارا مطلب ہے دس پندرہ غنڈوں نے یہ طوفان جوت دیا ۔‘‘

’’ پچاس سے کم نہیں تھے۔ بعد میں اور لاریاں بھی آئیں۔‘‘

’’ چلو وہ پچاس ہی ہوں گے ، مگر وہ لوگ تو کہہ رہے تھے کہ پانچ ہزار کا مجمع دھاوا بولنے آیا تھا ۔ اسی سے اندازہ لگا لو کہ یہ لوگ رائی کا پربت بنا رہے ہیں ۔‘‘

’’ آ گ لگانے کو چنگاری بھی کافی ہوتی ہے ۔‘‘

’’ تمہارا مطلب ہے یہ بلوے میں کرایا کرتا ہوں ؟‘‘

’’ آپ نہیں تو آپ ہی جیسے کوئی دوسرے ہوں گے ۔ ورنہ یہ بتائیے کہ اگر یہ کالج کے لڑکوں کی لڑائی تھی تو زیادہ تر وہ غریب مستری کیوں تباہ ہوئے جو آپ کے کارخانے کے لیے خطرہ بنے ہوئے تھے ؟ انہیں کی

جھونپڑیاں اور دکانیں جلیں جو آپ سے ہٹ کر رہے تھے ۔''

چند سیکنڈ کے لیے ہوٹل کے کمرے میں موت کا سا سناٹا چھایا رہا ۔ نیلو فر کو ایسا لگا جیسے صدیاں خاموشی سے بیت گئیں — اور پھر طوفان ٹوٹ پڑا :

'' دو ٹکے کی رنڈی اور ہمارے منہ آئے ! کوئی نیا یار ڈھونڈ لیا ہے کیا ؟ میں جتنی طرح دے رہا ہوں اتنا ہی پیر پسار رہی ہے ۔ کتنی بار کہا کہ یہ باتیں تمہاری سمجھ سے باہر ہیں ۔ یہ قادر بھائی سے معاملہ چل رہا ہے ، آسی نے کان بھرے ہوں گے تمہارے ۔ غدار زمانے بھر کا ۔ پول کھول دوں تو لینے کے دینے پڑ جائیں ۔ سالے نے بلیک مارکیٹ کا روپیہ کھلا کھلا کر حمایتی جمع کر لیے ہیں ۔ انہیں کے بل بوتے پر اکڑتا ہے ۔ تم مجھے فرقہ پرست کہہ رہی ہو ؟ تمہیں میں نے کنگلنی سے ایک دم رانی بنا کر بٹھا دیا ۔ میرے دوستوں میں ہر فرقے کے لوگ ہیں ۔''

نیلوفر کے بھیجے میں طوفان آبلنے لگے ۔ وہ بھی غصے کی پوری تھی ۔

'' میں نے آپ کو فرقہ پرست نہیں کہا ۔'' وہ بڑے ضبط سے بولی ۔

'' پھر کیا کہا ؟''

'' میں نے تو ... میں نے کچھ نہیں کہا ۔'' وہ پھوٹ

پھوٹ کر رونے لگی ۔

’’ تم نے مجھے خونی کہا — پاکھنڈی کہا — اور کیا کہنا چاہتی ہو ؟ جاؤ اور بھرے بازار میں کہتی پھرو ، دیکھیں گے ہم بھی کہ کون سنتا ہے تمھاری ؟ اپنے کو سمجھا کیا ہے تم نے ؟ قسم سے میں بھی اپنی سی پر آ جاؤں تو بمبئی میں جینا دوبھر ہو جائے گا ۔ فارس روڈ پر سڑ کے مروگی ۔ کوئی شریف آدمی جنم میں تھوکے گا بھی نہیں ۔ یہ سالا فلیٹ سلیٹ چار دن میں نیلام کراکے فٹ پاتھ پر ڈلوا دوں گا ۔‘‘

نیلوفر سر جھکائے آنسو بہاتی رہی ۔

راجہ صاحب موم کے نہ سہی ، نمک کے بنے ہوئے ضرور تھے ، جلد ھی بہنے لگے ۔

’’ اچھی میری دوست بنتی ہو ۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہو کہ کارخانے میں گھاٹا ھی گھاٹا ہے ۔ ایک ایک بوند کے لیے گھٹنے ٹیک دینے پڑتے ھیں ۔ اگر ڈھیل دیتا چلا جاؤں تو دو دن میں دیوالہ پٹ جائے ۔ ایک سے ایک بڑھ کر مگرمچھ منہ پھاڑے ہوئے ہے ۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھتیں ۔ کہاں تک تمھارے دماغ میں کوئی ٹھونسے ۔ ہم لوگوں کی مشکلوں کا کوئی ٹھکانا ہے ؟ اُدھر بزنس میں بنیا تنبو پھیلائے پڑا ہے ۔ جاگیریں چھن گئیں ۔ گورنمنٹ

کوئی حفاظتی قدم نہیں اُٹھاتی ۔ اپنا بچاؤ خود ھی کرنا پڑتا ھے ۔ چلو مان لیا کہ میں نے اپنے کاروبار کی حفاظت کے لیے ذرا سختی سے کام لیا ، تو اس کا یہ کیسے مطلب ھؤا کہ بلوہ میں نے کر وایا ۔ یہ اتنے شہروں میں جو خون خرابہ ھو رھا ھے ، کیا وہ بھی میں نے کروایا ھے؟ مجھے کیا نفع ھؤا ان جھگڑوں سے؟ وھاں تو میرا کوئی کاروبار بھی نہیں ۔ یہ لوگ تو دیوانے کتوں کی طرح لڑا ھی کرتے ھیں ۔ نیچی قوم کے لوگ ھی مرتے کٹتے ھیں ، شریف تو ھر طرح مل جل کر ھی رھتے ھیں ۔‘‘

نیلوفر چپ چاپ بھاشن سن کر پلنگ پر اوندھے منہ پڑ گئی ۔

’’ اب یہ رو رو کر آنکھیں سجانے سے فائدہ ؟ ‘‘ آنہوں نے اُس کا شانہ ھلایا ۔

’’ بھاڑ میں جائیں یہ سب ۔ ‘‘ نیلوفر نے ٹھنڈے دل سے سوچا ۔ ’’ بقول کسے دو پیسے کی لکھیائی ھوں ، کوئی قوم کی لیڈر تو نہیں ۔ نہ جانے کون جھوٹا ھے اور کون سچا ۔ کون مارتا ھے اور کون مرتا ھے ۔ سب کچھ خدا کی مرضی ھی سے ھوتا ھے ۔ وہ سب سے بڑا منصف ھے ۔ وہ ھر مجرم کو خود ھی سزا دے گا ۔ جسے چاھے گا عزت دے گا ، جسے چاھے گا ذلت دے گا ۔ یہ چندن ھار ، بنارسی

جوڑے ، زبیدہ کے دولہا کا جوڑا — اگر زبیدہ کی شادی میں خدا نہ کرے کوئی کھنڈت پڑگئی تو کیا یہ مردے جی اٹھیں گے ؟ ان کی جلی ہوئی دکانیں اور جھونپڑیاں پھر سے بن جائیں گی ؟ جب معصومہ نیلوفر بنی تو دنیا والے کہاں تھے ؟ کس نے سر پر ہاتھ دھرا ؟ یہاں تو بس اپنی ڈفلی اور اپنا راگ ! اپنی بلا سے کوئی جیے یا مرے ۔''

'' اے جی میں کہتا ہوں اب اٹھو گی یا پڑی سوگ مناتی رہو گی ۔'' راجہ صاحب اس سے بھڑ کر لیٹ گئے ۔

'' جائیے ہم سے بات نہ کیجیے ۔'' دم بھر کے لیے گمراہ ہونے والی رنڈی جاگ اٹھی ۔

'' اچھا ذرا ہماری طرف منہ کرو ۔''

'' رہنے دیجیے ۔ ذرا بھی کوئی بات کروں تو کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں ۔ میرے دل میں کوئی شبہ ہو تو آپ سے نہ کہوں تو کیا چوراہے پر پوچھتی پھروں ؟ اس مردود قادر بھائی سے جا کر پوچھوں ؟ کیسی جلی کٹی سناتا ہے جب ملتا ہے تو ۔''

'' کیا جلی کٹی سناتا ہے ؟''

'' کہ شریف خاندان کی لڑکی ایسے لوگوں کے چکر میں کیوں پھنسی ؟''

'' پھر تم نے کیا جواب دیا ؟''

'' میں نے کہہ دیا کہ یہ لوگ میرے فیملی فرینڈ ہیں - میں تو اپنی بہن کا جہیز خریدنے آئی ہوں - زبیدہ کے سسرال والوں کا نام سن کر اتنا سا منہ نکل آیا -''

'' پھر ؟''

'' پھر فساد کے بارے میں کہنے لگے کہ سب پہلے سے تیاریاں ہو چکی تھیں -''

'' اور تم نے یقین کر کے میرا بھیجا چاٹنا شروع کر دیا - اچھا اُس نے یہ بھی بتایا کہ ان لوگوں نے میرے کارخانے میں آگ لگانے کی کوشش کی تھی -''

'' قادر بھائی کہہ رہے تھے کہ یونہی جھوٹ موٹ باہر سے لوگوں کو بلا کر چوکیدار کی کوٹھری میں خود ہی آگ لگوا دی -''

'' اور پھاٹک جو توڑ ڈالا ، وہ بھی میں نے خود تڑوایا ؟ تمام کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور کر دیے - اس حرام زادے کی باتیں سن کر تم نے یقین کر لیا -''

'' کمبختوں نے بے چارے چوکیدار کی کوٹھری کیوں جلا دی ؟''

'' وہ دوسری بن جائے گی - میں نے منشی سے کہہ دیا ہے کہ اُسے اپنی کوٹھی کے شاگرد پیشے میں جگہ دے دیں اور پکی کوٹھری جلدی سے جلدی بنوا دیں -

مجھ سے تو جو کچھ بھی ہو سکتا ہے ان غریبوں کے لیے کرتا ہی رہتا ہوں۔ اچھا اب آٹھو بھی۔ تیار ہو جاؤ، پھر کیا تھا فون آس نے۔''

'' آوں — ہمارا جی نہیں چاہتا۔''

'' برا مان جائے گا بھئی۔''

'' ماننے دو مردے کو۔ آپ کا کام تو پورا ہوگیا اب۔''

'' ارے نہیں بھئی۔ اصل کام تو اب پڑے گا سالے سے۔ تم کیا سمجھتی ہو، ایک سے ایک حرامی بھرا پڑا ہے۔ ابھی تو جھگڑے آٹھائے جائیں گے، انکوائری ہوگی، رپورٹیں تیار ہوں گی۔''

'' پھر؟''

'' پھر یہ کہ کرنل بڑا بارسوخ آدمی ہے۔ بڑا لچا ہے۔ اس سے معاملہ طے ہؤا تھا۔ اب اگر میں اپنی بات سے پھر کر غچہ دے جاؤں تو میری جان کا دشمن ہو جائے گا۔ قادر بھائی کی پارٹی سے مل کر بہت ہلکان کرے گا۔ کمیٹی پر آس کا نام ضرور ہوگا۔ کسی نہ کسی طرح میرا یار ہر جگہ گھس ہی جاتا ہے، اس لیے سہنا پڑتے ہیں آس کے نخرے۔''

'' مر جائے کمبخت!''

'' تمھارے منہ میں گھی شکر۔ مگر یہ جھگڑا ختم

ہو جائے ایک دفعہ ، پھر میں بھی سالے کو وہ مزا چکھاؤں گا کہ یاد ہی کرے گا ۔ ویسے بھئی تم پر تو بری طرح لٹو ہوگیا ہے بیچارا ۔ میرے پیچھے پڑا ہے کئی دن سے ۔ کہتا ہےکہ مڈل ایسٹ تمھیں ساتھ نہ لے جاؤں ۔''

'' کیوں ؟''

'' وہ یہاں تمھاری جدائی میں سورگ باش ہو جائے گا ۔''

'' ہو جائے کتا ، میری جوتی سے ۔''

'' اچھا تو تم ذرا بال بنوا آؤ ۔ وہی موسل کی وضع کا جُوڑا بنوانا ، اُس پر وہ لمبے بندے ، جو آج خریدے ہیں ، ٹھیک رہیں گے ۔''

'' وہ تو زبیدہ کے ہیں ۔''

'' زبیدہ کے لیے کوئی دوسرے لے لیں گے ۔''

جب نیلوفر آتشیں ساڑھی پہن کر ، موسل کی وضع کا جوڑا باندھے ، لمبے لمبے آویزے جھلاتی بن ٹھن کر تیار ہوئی تو راجہ صاحب نے پیچھے سے جا کر اس سے بھڑتے ہوئے کہا:

'' آنکھیں میچو ۔''

'' کیوں ؟'' وہ ٹھنک کر بولی ۔

'' میچو آنکھیں ۔''

نیلوفر نے آنکھیں میچ لیں ۔ کھولیں تو جڑاؤ چندن ہار کرنوں کے جال کی طرح اُس کے روپہلی سینے پر تھرک رہا

تھا ۔ ایک دم اُسے ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے ننگے جسم پر پگھلا ہؤا سونا انڈیل دیا ۔ اُس کا تالو خشک ہوگیا اور بے اختیار اُس کے دونوں ہاتھ ہار کو نوچنے کے لیے اُٹھ گئے ۔ مگر ہار میں جیسے کوئی مقناطیسی طاقت چھپی ہوئی تھی کہ اُس کے ہاتھ وہیں چپک کر رہ گئے ۔ راجہ صاحب نے شانے پکڑ کر اُسے اپنی طرف موڑا اور وہ اُن کے ہاتھوں میں کمان کی طرح کھنچ گئی ۔

کرنل صاحب کی پارٹی بڑی جیتی جاگتی اور ہنگامہ خیز تھی ۔ غور سے دیکھنے سے پتہ چلتا تھا کہ زیادہ تر لوگ پچاس پچپن کے سن کے ہوں گے ۔ عورتیں کم سن اور چلبلی تھیں ۔ کسی کی کم از کم پہلی بیوی تو وہاں موجود نہیں ہوگی ۔ سب نیلوفر کی عمر کی یا اُس سے چھوٹی ہی تھیں ۔ خواتین کی تعداد چونکہ کم تھی ، لہٰذا مل بانٹ کے لوگ ہنس بول رہے تھے ۔ نیلوفر اور راجہ صاحب ذرا دیر سے پہنچے ۔ ہوٹل سے ایک ایک پیگ لگا لیا تھا ، مگر وہ لوگ تو پانچ بجے سے ڈٹے ہوئے تھے ۔

”آخاہ ، آداب عرض ہے ۔“ اُسے راجہ صاحب سے الگ دیکھتے ہی قادر بھائی نے آدبوچا ۔ وہ ٹال کر چلنے لگی تو قادر بھائی ہنسا ۔

''تو ہمارا اندازہ ٹھیک تھا ۔''

''کیا مطلب ؟'' وہ رک گئی ۔

''ڈانٹ پڑی ؟''

''کیسی ڈانٹ ؟''

''ہم سے نہ اُڑیے — ہم اُڑتی چڑیا کے پَر گن لیا کرتے ہیں ۔''

''بھئی ہم سے پہیلیاں نہ بجھوائیے۔'' اُسے ہر مرد سے تتلا کر بولنے کی عادت پڑ چکی تھی ۔

''ہم سے بات کرنے کو منع کیا گیا ہے ۔ اب دیکھیے مکرنے سے کوئی فائدہ نہیں ۔''

''مکرنے کی کیا ضرورت ہے صاحب ۔ کوئی تو بات ہوگی جو منع کیا ۔''

''بات یہ ہے کہ راجہ صاحب کی اس ناچیز سے پھونک سرکتی ہے ۔''

''اچھا ؟'' نیلوفر جل گئی ۔

''جی ہاں ، اس لیے کہ ہم اس کا سارا کچا چٹھا جانتے ہیں ۔ بڑا بدنصیب ہے بیچارا ۔''

''وہ کیسے ؟''

''کوئی لونڈیا ٹکتی ہی نہیں بیچارے کے پاس ۔ یار لوگ لے اُڑتے ہیں ۔ گھُنا ہؤا مال ہے نا ، جبھی تو نخرے

برداشت کر لیتا ہے ۔''

'' آپ کو راجہ صاحب سے خدا واسطے کا بیر ہے ۔''

'' نہیں ، یہ بات نہیں۔ ہمارا وہ کیا بگاڑ سکتا ہے ؟ اس سے زیادہ ہمارا انفلوئینس ہے ۔ اس سے زیادہ ہمارے پاس پیسہ ہے ۔ وہ دوکوڑی کا زمیندار راجہ بن بیٹھا ہے ، ہم دو سو برس سے بزنس میں ہیں ۔ تو اگر جلتا ہے تو وہ ہم سے جلتا ہے اور ڈرتا بھی ہے ۔ اب یہ جو اس نے گڑ بڑ کی ہے تو ہم سے دبنا پڑے گا اسے ۔''

'' کیوں ؟''

'' ہمارا ہر بس میں بڑا انفلوئینس ہے ۔ ہم سالے کی دھجیاں بکھیر دیں گے ۔''

'' تو آپ یہ باتیں مجھ سے کیوں کہہ رہے ہیں ؟ ان ہی سے کہیے نا ۔''

'' ہم تم سے اس لیے کہہ رہے ہیں کہ تم اُس سے کہو کہ بریلی میں جو اس کا سینما ہے وہ ہمارے ہاتھ بیچ دے ۔''

'' کیا کریں گے آپ اس سینما کا ؟ ایسی کیا مار پڑی ہے ؟''

'' بس ہے ہمیں ضرورت ۔''

نیلوفر نے جب راجہ صاحب سے ذکر کیا تو اُنھوں نے بڑی موٹی موٹی گالیاں دیں ۔

'' اے ہے آخر کیا سرخاب کے پر لگے ہیں اس سینما میں ؟'' نیلوفر چڑ گئی ۔

'' بات یہ ہے کہ وہ حصہ ٹاؤن پلاننگ کے حلقے میں آنے والا ہے ۔ آدمی کا رسوخ ہو تو سرکار سے بہت اچھے دام ملیں گے ۔ مجھ سے اونے پونے خرید کر وہ اُس کی ڈبل قیمت وصول کر لے گا ۔''

'' مگر اس کا اتنا اثر کیوں ہے ؟''

''بس اُس نے رگ داب لی ہے ۔ اپنے فرقے کا لیڈر ہے، غل مچانے لگتا ہے ۔ اسے خاموش کرنے کے لیے منہ بھرنا پڑتا ہے ۔''

'' یعنی اگر اس کا منافع ہو جائے تو اس کے فرقے کے لوگوں کی شکایتیں دور ہو جاتی ہیں ۔''

'' کم از کم یہ ان کا ذکر تو جلسوں میں نہیں کرتا ۔ اخباروں میں چکنے چپڑے بیانات دے دیتا ہے ۔ ویسے بالکل چمگادڑ سمان ہے، کبھی اس پارٹی میں تو کبھی اُس پارٹی میں ۔ دوسرے تم نہیں جانتیں ، اپنے سب سے بڑے دشمن ہم خود ہیں ۔ یہاں ایک کی چوٹی دوسرے کے جوتے تلے دبی ہوئی ہے ۔ ہاں تو تم اس سؤر کے بچے سے کہہ دینا کہ سینما مل جائے گا ۔ میرے کارندے سے جا کر مل لے ۔''

'' مت دیجیے نا ۔''

'' نہیں جی ۔ اس وقت اگر اُس نے اُلٹی سیدھی کمیٹیاں

میرے پیچھے لگا دیں ، تحقیقاتیں شروع کر دیں تو بے کار کی درد سری ہو گی ۔''

'' جب آپ نے کچھ کیا ھی نہیں تو پھر آپ کی جوتی ڈرتی ہے تحقیقاتی کمیٹیوں سے ۔''

'' عورت کا بھیجا سچی میں پاؤ رتی کا ھوتا ہے ۔ اری پگلی یہ دنیا ہے ۔ تم نے دیکھا ھوگا ، اس سے پہلے کہ جانور زمین پر گرے ، گدھ منڈلانا شروع کر دیتے ھیں ۔ اور ادھر لڑکھڑایا کہ بس ٹوٹ پڑے ۔ نہ جانے کتنے لوگ جلے بیٹھے ھیں ۔ بہانہ مل جائے تو کچا چبا جائیں ۔ اس کے علاوہ قادر بھائی سات پشت کا بنیا سہی ، گرہ کی عقل کچھ نہیں ۔ لے تو رھا ہے یہ سینما ، مگر سر پکڑ کے نہ روئے تو نام پلٹ دینا ۔'' راجہ صاحب نے قہقہہ لگایا ۔

'' کیا مطلب ؟ میں سمجھی نہیں ۔''

'' نہ سمجھو رانی ، یہی اچھا ہے ۔ قسم سے آج تو اپسرا لگ رھی ھو ۔''

'' ھٹیے ۔ سر پکڑ کر رونے کی کیا بات ہے ؟''

'' کچھ لوگ اوپر ھی اوپر پلان بنا رہے ھیں ۔ اگر ایسا ھؤا تو سارا ٹاؤن پلاننگ کا نقشہ ھی بدل جائے گا اور تب سالے کو پتہ چلے گا تو بلبلا کر رہ جائے گا ۔''

'' اے ہے ، تب تو بڑا مزہ آئے گا ۔''

" ہاں بڑا سٹپٹائے گا ۔ ادھر بڑے زوروں سے جھگڑا چل رہا ہے ۔ آس کے 'پرکھوں کو بھی خبر نہیں کہ معاملہ ابھی زیرِ غور ہے ۔ یعنی کھٹائی میں پڑا ہے ۔ میں چاہ رہا ہوں کہ میری کھاری کوئیاں والی زمین حلقہ میں آجائے ۔ بڑی نا کارہ چیز ہے ، مگر اچھے دام مل جائیں گے ۔"

" کیسا جھگڑا چل رہا ہے ؟ "

" ارے بھئی سب ہی اپنی اپنی زمینوں کو بھڑانے کی فکر میں ہیں ۔ وہ تو جس کی آواز اونچی ہوگی اسی کا کام بن جائے گا ۔ سب ہی زور لگا رہے ہیں ۔"

پارٹی شباب پر تھی ۔ ہر فرقے اور مذہب کے نمائندے موجود تھے ۔ لوگ دو دو چار چار کی ٹکڑیوں میں ، ہاتھوں میں گلاس تھامے ، ایک دوسرے کی بدگوئیوں میں مصروف تھے ۔ بیوپار ، سیاست اور فلسفۂ زندگی کے موضوع سے لے کر مصنوعی اور غیر مصنوعی جسمانی ساخت تک — ہر رنگین اور بھد میلے ٹاپک پر تبادلۂ خیالات ہو رہا تھا ۔ کرنل صاحب کا چہرہ فرطِ مسرت یا شراب کی گرمی سے چقندر ہو رہا تھا ۔ وہ مسلسل نیلوفر کے گرد منڈلا رہے تھے ۔ بار بار اس کے پیچھے آ کر کھڑے ہو جاتے اور گرم گرم بھاپیں اس کی گردن پر چھوڑنے لگتے ۔ ان کی توند ان سے پہلے نیلوفر سے لپٹ جاتی اور وہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑتی ۔

قادر بھائی مس بھارتی سنہا کے پہلو سے ایسے چسپاں ہو رہے تھے جیسے دونوں کے جسم میں ایک ہی ڈھانچہ پرویا ہؤا ہو ۔ مسٹر انجنیر مسز مارٹن سے ضرورت سے زیادہ بے تکلف ہرتے جا رہے تھے ۔ مہمان مختصر ترین جتھوں میں تقسیم ہو رہے تھے ۔ کس قدر شان دار یک جہتی کا مظاہرہ ہو رہا تھا ۔ مختلف صوبوں اور فرقوں کے لوگ آپس میں یوں ایک دوسرے پر قربان ہو رہے تھے کہ شبہہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ کبھی انہیں دو فرقوں کے انسان ایک دوسرے کے خون سے ہولی کھیل رہے تھے اور جھونپڑیاں جلا رہے تھے ۔ اگر خوش اسلوبی اور ہوشیاری سے طبقاتی کشمکش کے دھارے کو موڑ کر اسے فرقہ واریت کا رنگ دے دیا جائے تو ان مرنے مارنے والوں سے کسی کو ہمدردی نہیں رہتی ۔ ان مستریوں میں ، جو راجہ صاحب کے کارخانے کے لیے خطرہ بن گئے تھے ، دونوں فرقوں کے لوگ تھے ۔ اپنے اصلی دشمن کی طرف ان کا دھیان بھی نہ گیا ۔ وہ بڑی مستعدی سے ان کے منصوبے کو کامیاب بنا رہے تھے ۔

رات گہری ہو گئی ۔ بوفے ڈنر کا انتظام تھا ۔ بیسیوں قسم کے کھانے چنے ہوئے تھے ۔ کھانے والے کھا رہے تھے ، مگر زیادہ تر مرد اور چند خواتین ابھی تک پینے پر جٹے ہوئے تھے ۔ نیلوفر بڑی ترنگ میں آئی ہوئی تھی ۔ کرنل

صاحب اس کی پلیٹ میں مرغ کی آٹھویں ٹانگ لاد کر اس کی گردن پر گیلی گیلی پھنکاریں مار رہے تھے ۔ ایک طرف ایک صاحب خاموش سب سے الگ تھلگ کرسی پر بیٹھے تھے ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر ذرا سی ٹھیس لگ گئی تو ساری چھلک جائے گی ۔ ایک نہایت ہر دل عزیز شاعر صاحب نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے نہایت بے تکلفی سے اپنا پاجامہ تر کر لیا تھا ۔ ان کے اشعار پر سر دھننے والی خواتین آن سے دور کھڑی نفرت سے ناکیں سکٹر رہی تھیں ۔ مرد نہایت خوش تھے ۔ شاعر صاحب مرد جاتی کے روحانی رقیب روسیاہ تھے اور ان کی اس درگت سے ذرا ان کی قیمت گر جانے کی امید ہو رہی تھی ۔ بڑی مشکل سے دو نوکروں نے انہیں بھلا پھسلا کر اٹھایا تاکہ رکشا میں بھر کر مال واپس کر آئیں ۔ مگر وہ بہت بگڑ رہے تھے کہ ابھی تو ان کی باری نہیں آئی ، حسین ترین اشعار تو ابھی سنائے ہی نہیں ۔ مگر لوگ ان کی اس قدر فی‌البدیہہ شاعرانہ حرکت سے کافی سیر ہو چکے تھے ، اس لیے ان کی سنوائی نہ ہوئی ۔ بیرے انہیں زبردستی کھینچتے ہوئے لے گئے ۔ نیلوفر سے ہاتھ ملا کر رخصت ہونے کے ارمان میں موصوف بلبلاتے ہی چلے گئے ۔

ایک صاحب نہ جانے کس بات کی بار بار سب سے معذرت چاہے جا رہے تھے ۔ ہزار بار ” کوئی بات نہیں “

کھنے کے بعد بھی وہ معافی مانگنے پر جٹے ہوئے تھے - ایک محترمہ بار بار اپنا پرس اور رومال نہ جانے کہاں رکھ کر بھولی جا رہی تھیں ۔ لوگ بڑی خندہ پیشانی اور فخر سے بار بار سرک کر انہیں بٹوہ تلاش کرنے میں مدد دے رہے تھے ۔ ان کے تازہ ترین ایڈمائرر ایسے پریشان تھے گویا رومال نہیں کوہ نور ہیرا کھو گیا ہے ۔ انہیں ان لوگوں پر طیش آ رہا تھا جو رومال کی گمشدگی پر قطعی ہیبت زدہ نہیں تھے ۔ سب کو اٹھ کر ننگا جھاڑا دینا پڑتا تب ان کا رومال ان کے بلاؤز یا آستین سے نکلتا ۔ تب بڑی شد و مد سے لوگ ان کی مدد کرتے اور وہ گدگدی سے بے تاب ہو کر صوفے پر لوٹ جاتیں ۔ کسی کا ان کی اس حرکت پر قطعی جی نہیں جل رہا تھا ۔

نیلوفر خالی پیٹ مستقل پینے میں مشغول تھی ۔ بوفے کی میز کی طرف دیکھتے ہی اسے ابکائی آنے لگی ۔ نشے میں جب ایک بات کی دھن سوار ہو جائے تو پھر نہیں اترتی ۔ نہ جانے کیوں نیلوفر کو شبہہ ہو گیا تھا کہ گوشت ضرور کتے کا ہے ۔ سنا تھا کانپور میں ایک گروہ پکڑا گیا تھا جو چھوٹے چھوٹے بچوں کو پکڑ پکڑ کر ان کے کباب بنا کر بیچا کرتا تھا ۔ وہ بار بار آنکھیں چندھی کر کے گوشت کی چیزوں کو دیکھے جا رہی تھی ۔ ایک دفعہ تو اس نے

ایک ننھی سی انگلی بھی شوربے میں تیرتی دیکھی ۔ لاکھ سب نے سمجھایا کہ دم کی ہڈی ہے ، مگر وہ کسی طرح نہ مانی ۔ اور جب ہنستے ہوئی راجہ صاحب نے ہڈی منہ میں ڈال کر کٹر کٹر چبا ڈالی تو وہ ابکائی روکتی پلیٹ پھینک کر بھاگی ۔ ترکاری تک میں اسے انسانی آنکھیں اور دانت نظر آ رہے تھے ۔ راجہ صاحب اسے بار بار روک رہے تھے کہ زیادہ پینا مناسب نہیں ، مگر کرنل صاحب کی پالیسی کے مطابق اسے زیادہ سے زیادہ پلانے کی کوشش کی جا رہی تھی ۔

ایک دم نیلوفر کو محسوس ہؤا وہ بالکل اکیلی دور کہیں ایک بنجر چٹان پر کھڑی ہے ۔ چاروں طرف سناٹا گرج رہا ہے ۔ موت کی سی خاموشی رو رہی ہے ۔ اگر پیدا ہونے سے پہلے کسی نے اس سے پوچھ لیا ہوتا تو وہ جان بوجھ کر تو دنیا میں نہ آتی ۔ بے اختیار اسے زندگی کی بے بسی پر رونا آنے لگا اور وہ راجہ صاحب سے لپٹ کر پھوٹ پڑی ۔ وہ اسے بالکل ابا جی معلوم ہو رہے تھے اور وہ خود نیلوفر نہیں جیسے ان کی نوجوان بیوی تھی ، جس کی خاطر انہوں نے گھر بار ، بال بچے تج دیے تھے ۔ کاش کوئی اس سے بھی ایسی بے تابی سے پیار کرے ۔ اس کے لیے اپنا خاندان چھوڑ دے ۔ کسی مضبوط بانہوں والے رکھوالے کی آغوش میں چھپ جائے ، پھر یہ انجانے خوف اسے نہیں ستائیں گے ۔

آخر کسی کو اس کی پاکدامنی اور نسوانیت کی فکر کیوں نہیں ؟ کیا وہ عورت نہیں ؟ اس کا دل بھی تو لاکھوں پیاری پیاری باتوں کے لیے دھڑکتا ہے ۔ کاش وہ بھی کسی کو اتنی عزیز ہو جائے کہ وہ کرنل صاحب کو اس کے پیچھے کھڑے ہو کر بھاہیں چھوڑنے سے روکے ۔ اس نے راجہ صاحب کے گریبان میں جھول کر آنسو بہانے شروع کر دیے ۔ پروگرام کے مطابق آج وہ کرنل صاحب کی مہمان تھی، اس لیے وہ اسے سنبھالنے لپکے ، مگر وہ ضدی بچے کی طرح راجہ صاحب سے چمٹ گئی ۔ راجہ صاحب اور کرنل صاحب میں بحث ہونے لگی ۔ نہ جانے کون جیتا ، کون ہارا ۔ کس نے اسے سنبھالا ۔

" ابا جانی ۔ ابا جانی ۔ مجھے لے لو ۔ ابا جانی ۔" وہ سسکیاں لیتی نیند جیسی مدھوشی میں ڈوب گئی ۔

اس رات اس نے پھر وہی نا مراد خواب دیکھا ۔ وہ اکیلی چلی جا رہی ہے ۔ چلی جا رہی ہے ۔ اسی جانی پہچانی انجان سڑک پر ۔ وہ سڑک جو اژدھے کی طرح ہانپ رہی ہے ۔ جس کے خاتمے پر مہیب دہانہ ہے ! اس کے گلے میں سسکیاں منجمد ہو چکی ہیں اور آنسو خشک ہیں ۔

ہمیشہ کی طرح چیخ مار کر وہ جاگ پڑی ۔ کمرے کی گھٹی ہوئی روشنی میں راجہ صاحب کا تحفہ ، چندن ہار ،

اس کے سینے پر جگمگا رہا تھا ۔ پھر اس نے آنکھیں جھکا کر دیکھا ۔ چندن ہار قہقہہ مار کر ہنس پڑا ۔ موتی جگر جگر مسکرانے لگے ۔ لال لال خون میں لتھڑے ہوئے مستریوں کے سر اور ننھے ننھے بچوں کی کھوپڑیاں اس کے ننگے سینے پر قہقہے مار کر ہنسنے لگیں ۔ وہ چیخ مار کر پلنگ سے نیچے گر پڑی اور چندن ہار کو دونوں ہاتھوں سے نوچنے لگی ۔ کرنل صاحب نے آسے بہت چمکارا ، کلیجے سے لگایا ، مگر اسے جیسے جاڑا بخار چڑھ رہا تھا ۔ آس کو گھن آ رہی تھی ، مگر ڈر کے مارے گھگی بندھی ہوئی تھی ۔ اس وقت کرنل صاحب کا وجود ہی غنیمت تھا ۔ وہ صبح تک آہ و زاری کرتی رہی ، کراہتی رہی ۔

دلہن کی جٹھانیاں اور نندیں چیزوں کی بڑی مستعدی سے فہرست بنا رہی تھیں ۔ خاص طور پر چندن ہار کی تعریفوں میں تو بیویوں کی زبانیں سوکھی جا رہی تھیں ۔ مگر نیلوفر ڈر کے مارے اب تک چندن ہار کی طرف نہیں دیکھ پا رہی تھی کہ کہیں کمبخت ٹھٹھا مار کر ہنس نہ پڑے ۔ کیا غریب بھاگ بھاگ کر مہمانوں کی خاطر مدارات کر رہی تھی ۔

رخصت کے وقت وہ بہن کو کلیجے سے لگا کر اس بری طرح بلک کر روئی کہ دشمنوں کی بھی آنکھیں بھیگ گئیں ۔

میرے پاس کھڑی ایک بیوی نے کان میں پھسپھسایا :
'' زبیدہ نیلوفر کی ناجائز بچی ہے ۔''
جی چاہا پوچھ لوں : '' اور آپ ؟''

شادی کے ہنگامے میں نیلوفر نے نشے کو ہاتھ بھی نہ لگایا ۔ جب سچے موتی جیسی پاک اور آبدار بہن بیاہ کر چلی گئی تو اس نے مہمانوں کے رخصت ہونے کا بھی انتظار نہ کیا ۔ اپنے کمرے میں بند ہو کر اتنی شراب پی کہ دوسرے دن شام تک بے سدھ پڑی رہی ۔ کبھی کبھی کمرے میں سے آهوں اور سسکیوں کی آواز آتی اور پھر قبر کی سی مردنی چھا جاتی ۔

'' اچھی ہوں امی جان ۔ '' وہ بیگم کے پے در پے کھٹکھٹانے پر کہتی ۔ انہیں بڑی کوفت ہو رہی تھی ۔ لوگ آ کر لوٹے جا رہے تھے اور نوابزادی کی میت کمرے میں بند پڑی تھی !

بیگم نے تیسرے دن گھبرا کر صف ماتم بچھا دی ۔ دروازہ کھلوا کر چھوڑا ۔ ہاتھ پیر جوڑ کر اسے ڈاکٹر کے پاس چلنے پر راضی کیا ۔ ایک ہفتہ تک نیلوفر غایب رہی ۔ لوگوں نے کہا : '' حمل گرانے ہسپتال گئی ہے ۔''

کچھ دنوں کے لیے نہ جانے وہ کہاں غایب ہو گئی ۔ پھر جو آئی تو دونوں دونوں ہاتھوں سے زندگی کو لٹانے لگی ۔ اس کے قہقہے پہلے سے زیادہ کھنکدار ہو گئے ۔ چہرے

کی بھشکار چھپانے کے لیے میک اپ کی مقدار اتنی بڑھا دی
کہ میں اپنی بالکنی سے اس کی مصنوعی پلکیں گن سکتی۔
پھر لمبی لمبی کاریں اس کے فلیٹ کے سامنے رین بسیرا لینے لگیں۔
اب شراب کے علاوہ اسے اور سارے نشوں کی لت پڑ گئی
ہے۔ پینا تو احمد بھائی سکھا گئے تھے۔ دھتورے کے
سگریٹ اس نے سورج مل جی سے سیکھے۔ کوکین کے
انجکشنوں کا تحفہ راجہ صاحب نے دیا۔ سنکھیا ایک منچلے
پروڈیوسر نے چکھا دی۔ غرض ہر عاشق اسے کوئی نہ کوئی
سہارا دیتا، تاکہ زندگی کی کڑواہٹ کچھ کم ہو جائے۔
احسان صاحب اب بھی پرانے زخم کے کھرونچے کی طرح
موجود ہیں۔ وہ اس خاندان کی جان کو ایک مستقل عذابِ
الٰہی کی طرح لگ گئے ہیں۔ اب تو وہ اتنے قلاش ہو گئے
ہیں کہ ان کے جال میں کوئی گاؤدی سیٹھ تو کیا مکھی
بھی نہیں پھنستی۔ وطن میں ان کی بیوی اور بچے فاقے کر رہے
ہیں، اس لیے اب وہاں بھی نہیں جاتے۔ اب انہیں یہ بھی پتہ
چل گیا ہے کہ اتنی بڑی دنیا ہے، اگر وہ ایک وقت کا کھانا
ایک شخص کے ہاں کھا لیں تو کوئی کنگال نہیں ہو جائے
گا، اس لیے وہ بھرے پرے دسترخوانوں کی تاک میں رہتے
ہیں۔ اب بھی کوئی آلو پھنس جائے تو اپنے منصوبوں کا
گٹھر کھول کر بیٹھ جاتے ہیں:

'' راجندر کمار کے پاس تو ڈیٹس نہیں ۔ دلیپ اکتوبر سے پہلے ایک دن بھی نہیں دے سکتا ۔ اس کے بعد تو کہتا ھے کہ احسان صاحب جتنے دن چاھیں لگا تار شوٹنگ کر لیجیے گا ۔ تین لاکھ پیشگی کا تو انتظام ہو گیا ھے ۔ بس نوشاد صاحب مہابلیشور سے لوٹیں تو گانے ریکارڈ کرا لوں گا ۔''

مگر اب تو لوگوں نے چڑنا بھی چھوڑ دیا ھے ۔ ان کی باتوں پر نہ ھنسی آتی ھے نہ رونا ۔ نیلوفر کے گھر میں تو بس اب وہ اوپر کے کام کے رہ گئے ھیں ۔ شراب کباب کا انتظام کرنا ، سوڈے کی بوتلوں اور برف کی دیکھ بھال ، بچوں کی فیس یاد کر کے وقت سے بھجوانا ، بینک کی دوڑ دھوپ کرنا ، لانڈری سے کپڑے لانا ، لےجانا اور بیگم کے ساتھ سینما وغیرہ جانا ۔

زبیدہ کی شادی پر نیلوفر نے سب کا کہا سنا معاف کر دیا ۔ سورج مل جی کے ھاتھ پیر جوڑ کر منا لائی ۔ روشنی کا سارا انتظام ان ھی کے سپرد تھا ۔ احمد بھائی کے ھاں خود شادی کا رقعہ لے کر گئی ۔

'' بھابی ضرور آئیے گا ۔'' اس نے ان کی بیوی سے اصرار کیا ۔ راجہ صاحب کبھی بمبئی آئیں تو اس سے ملے بغیر نہیں جاتے ۔ لوگ کہتے ھیں اس کے پاس جادو کی بوٹی ھے یا الہ دین کا چراغ ، کوئی اس کے در سے نامراد نہیں جاتا ۔ وہ خود نہیں تو اپنی کسی سہیلی کو فراھم کر دیتی ھے ۔

حلیمہ کے پاس نہ علم ہے نہ حسن ۔ دولہاؤں کا بھاؤ دن بدن بڑھتا جا رہا ہے ۔ جوڑا گھوڑا اور ولایت جانے کا خرچہ لے کر بھی ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ حلیمہ کے کنوار پنے کا سارا الزام نیلوفر کی جان پر ہے ۔ اگر وہ بدکار نہ ہوتی تو کوئی شریف زادہ مفت اسے بیاہ کر لے جاتا ۔

سلیم کو لوگ رنڈی کا بھائی کہہ کر چڑاتے ہیں تو وہ خاموش ، سر جھکا کر آنسو بہاتا ہے ؛ تب نیلوفر کا کلیجہ کٹنے لگتا ہے اور وہ اسے موٹر سائیکل دلا کر بہلا دیتی ہے ۔ زبیدہ کا میاں اسے بہن کی بدکاریوں کے طعنے دیتا ہے اور وہ آٹھ آٹھ آنسو روتی ہے ؛ تب نیلوفر سچے موتیوں کی لڑیوں سے اس کے آنسو پونچھتی ہے ۔ ابھی پچھلی عید پر اس نے روٹھے ہوئے بہنوئی کو منانے کے لیے اسے نئی موٹر لے کر دی ، تب کہیں جا کر وہ سلام کرنے دو گھڑی کے لیے آیا ۔

یہ اے روڈ ہے ! شریفوں کا محلہ ۔ یہاں سادھو سنت رہتے ہیں ، جنھوں نے اپنے تپ کے زور سے سٹہ بازار سے لے کر عقبیٰ تک جیت لیا ہے ۔ کچھ دین و دنیا کے ٹھیکدار چور بازار کی دولت سے اونچی عمارتوں کو اور اونچا کر رہے ہیں ۔ رشوت اور غبن کے بل پر شاندار ریسٹوران کھول رہے ہیں ۔ انہیں نیلوفر کے چال چلن پر سخت اعتراض ہے ۔ اور اگر دوستوں کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ کب کے اسے شریفوں کی بستی

سے نکالنے کی یوجنائیں بنا ڈالتے — کیونکہ نیلوفر بدکار ہے !
لیکن سورج مل جی تو دیش سیوک ہیں ۔ آئے دن یتیم خانوں اور ودھوا آشرموں کا اوگھاٹن کرتے رہتے ہیں ، جہاں ان کے گلے میں لمبے لمبے ہار پڑتے ہیں اور ہاتھوں میں گلدستے دیے جاتے ہیں — کیونکہ وہ بدکار نہیں !

احمد بھائی قومی اداروں میں انسانیت اور شرافت پر لیکچر جھاڑتے ہیں ۔ لڑکیوں کے اسکول میں انعامات تقسیم کرتے وقت وہ بڑے چاؤ سے پیاری پیاری بچیوں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں ۔ شاید یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ان میں سے کون اس قابل ہیں جنہیں نیلوفر بنایا جائے — اس لیے وہ بدکار نہیں !

راجہ صاحب ملک کو انڈسٹریلائیز کر رہے ہیں ۔ اب آن کا کارخانہ بڑے زور شور سے ترقی کر رہا ہے ۔ وہ چناؤ میں کھڑے ہو رہے ہیں ۔ اسمبلی میں بیٹھ کر جنتا کی بھلائی کے لیے بڑے بڑے کام کریں گے ۔ تمام دیوارں پر چپکے ہوئے ان کے نام کے پوسٹروں میں آن کی قومی خدمات کی لمبی چوڑی فہرست موجود ہے ، مگر کہیں آن گم نام مستریوں کا ذکر نہیں جو لا پتہ ہو گئے ، جن کے بال بچے سڑکوں پر رل گئے ۔ اور نہ نیلوفر کے چندن ہار کا کہیں حوالہ دیا ہے — کیونکہ راجہ صاحب بدکار نہیں ! اور وہ دنیا ، جو معصومہ کو نیلوفر بناتی ہے ، بدکار نہیں ! صرف

نیلوفر بدکار ہے ! وہ نیلوفر جو اپنے خاندان کی پالن ہار ہے۔ ان بچوں کی ناجائز ماں ہے۔ ان کی ان داتا ہے — وہ بدکار ہے!

معصومہ — نیلوفر ! نیلوفر — معصومہ !

جیسے چکی کے ان دو پاٹوں کے بیچ پسنے والی شئے انسان نہیں گھنا ہؤا گیہوں کا ایک حقیر دانہ ہے جس نے احمد بھائی کو جھیل لیا ، راجہ صاحب اور سورج مل کو سہہ لیا ، زندہ موت سے سمجھوتہ کر لیا ، سنکھیا اور دھتورے سے سمجھوتہ کر لیا ، اپنے سارے کنبے کی زندگیوں کا زہر متھ کر غٹا غٹ پی لیا ۔

کبھی شام کو جب اس کے فلیٹ میں دھما چوکڑی مچی ہوتی ہے تو وہ بالکنی میں آکر چپ چاپ کھڑی ہو جاتی ہے اور اپنی خالی خالی آنکھوں سے ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخی کے اس پار — دور کہیں خوابوں کے دیس میں — اپنی اس کنواری دنیا کو ڈھونڈ رہی ہوتی ہے جو لٹ گئی ۔ وہ مہندی جو سوکھ کر ریت میں بکھر گئی ۔ وہ شہنائیاں جن کے سر پھٹ گئے اور شہانہ جوڑا جو کفن بن گیا !

میری سولہ برس کی جیتی جاگتی بیٹی
نوعمر سہیلیوں کے ساتھ رسی کود رہی ہے
اے کاش میں واپس اسے اپنی کوکھ میں چھپا سکتی !